فہرست مطالب

اردو مقالات

مولانا ظفر علی خان، خانگی زندگی کا ایک نقش/ ڈاکٹر زاہد منیر عامر ۵

ابن الرومی، ایک شاعر ایک تاریخ / مسز زریں ریاض ۳۱

اہم علمی و ادبی فارسی ویب سائیٹس / ڈاکٹر سید محمد فرید ۶۷

سبک ہندی کی فارسی غزل، نمایاں خصوصیات / ڈاکٹر محمد صابر ۸۱

عبدالعزیز البشری بحیثیت مزاح نگار/ ڈاکٹر حارث مبین ۹۱

فارسی مقالات

فارسی و پاکستان/ دکتر محمد ناصر ۱۰۵

منشی خیالی رام و روشهای حاشیہ نگاری او بر کتاب اعجاز خسروی امیر خسرو دهلوی / مصباح الدین نرزیقول محمود زادہ ۱۱۹

زبان های رسمی ہندوستان / سوبھاش کمار ۱۳۷

عربی مقالہ

الشعر الفارسی فی مرحلہ التجدید نیما یوشیج نموذجاً/ الدکتور احمد موسیٰ ۱۵۱

پنجابی مقالہ

شہادت خان لکھیرا: پنجاب دا ہک نشا بھر پاتر / ڈاکٹر سعید بھٹا ۱۶۷

انگریزی مقالہ

Arthor John Arberry As An Interpreter of the Holy Quran/ Dr. Sultan Shah 03

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 5 - 30

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

مولانا ظفر علی خان .....خانگی زندگی کا نقش

ڈاکٹر زاہد منیر عامر☆

Abstract:

Maulana Zafar Ali Khan was a famus poet of Urdu. His poetry created ripples among the Muslims of the sub-continent, and helped them think to resist for their right of independence. He was an unforgettable character of our independence movement. Maulana led a very active life and traveled far and wide for the national cause of the Muslims. During his itineraries, he wrote letters to his friends and especially to his loving wife. Through these letters, we come to know of his household life. This aspect of his life was remained unknown till now. This paper is an effort to explore this unknown aspect of Maulan's personal life.

قومی زندگی کے نامور کرداروں کے طور پر ہم جن شخصیتوں سے واقف ہوتے ہیں عام طور سے ان کی زندگی کا ایک ہی رخ ہمارے سامنے رہتا ہے۔عوامی اور عمومی زندگی سے ہٹ کر وہ کیسے تھے اور روز مرہ زندگی کے مسائل و معاملات ان پر کیسے اثر انداز ہوا کرتے تھے

☆ وزیٹنگ پروفیسر مسندِ اردو و مطالعہ پاکستان، جامعہ الازہر، قاہرہ۔مصر

اور وہ ان میں سے کیسے اپنا راستہ نکالتے تھے، یہ سب کچھ عام طور پر پردۂ خفا ہی میں رہتا ہے۔یوں بھی عام بین نگاہیں شخصیت کے پس پردہ تشکیلی عوامل کی جستجو کم ہی کیا کرتی ہیں۔مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) ہماری ماضی قریب کی قومی زندگی کا ایک ناقابل فراموش کردار ہیں۔آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے غیر مطبوعہ خطوط مولانا ظفر علی خان کی ازدواجی زندگی کا ایک نقش ہیں۔ یہ خطوط جن کا دائرہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۸ء تک کے زمانے کو محیط ہے مولانا کی زندگی کے اس پہلو کو پہلی بار روشن کررہے ہیں ۔ یہ ایک محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے شوہر کے خطوط ہیں جو وہ اندرون و بیرون ملک کے مختلف مقامات سے اپنی اہلیہ کو لکھتے رہے ہیں۔ ان خطوط سے اپنی اہلیہ کے ساتھ ان کے غیر معمولی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے کہ دیارِ غیر میں انھیں اپنی اہلیہ کی یاد آتی ہے اور اس عالم میں وہ اس کے خطوں کے تمنائی ہیں ، اس کے لیے میوے، مٹھائی اور تحائف خرید رہے ہیں، اسے رقوم بھجوا رہے ہیں، اس کے لیے سونے کی چوڑیاں بنوانا چاہتے ہیں،اپنے پروگراموں سے مطلع کررہے ہیں، گھریلو امور و معاملات میں ہدایات دے رہے ہیں، اس کے لیے ایک اچھے سے گھر کی تدبیر کررہے ہیں، جو شہر سے کسی قدر دور ہو، جہاں گرد و غبار نہ ہو، آب و ہوا اچھی ہو، جس کے ساتھ باغ بھی ہو اور اس میں عمدہ فرنیچر ہو، وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیگم اپنے بیٹے اور دیور کے ساتھ جا کر ایسی رہائش گاہ تلاش کرلے اور وہ واپس آئیں تو اپنے خوابوں کی اس جنت میں اتریں۔

انھیں اپنی اہلیہ کے خط کا کس قدر اشتیاق ہے، اس کا اندازہ ۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء کے مکتوب کی ان سطور سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''شکر ہے کہ تم کو بھی میرے نام خط لکھنے کی توفیق ہوئی۔ اختر کا خط جو پچھلے ہفتہ کھولا تو ایک کاغذ نظر پڑا جس پر چند مکوڑے چلتے ہوئے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو تمہارے پیارے ہاتھوں کے چند دل فریب نشان تھے جن کے چوم لینے کی ابھی تک اپنے دل میں جگہ پاتا ہوں ۔(۱) (خط نمبر ۵)

انھیں بیوی کی ناسازی مزاج دور دیس میں بے تاب و بے چین کردیتی ہے ، وہ متواتر خط لکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بیوی بھی انھیں طول طویل خط لکھے ان کے نزدیک باہمی محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کو اپنے احوال سے مطلع رکھاجائے اور اپنی زندگی و معمولات کی تفصیل ایک دوسرے سے شیئر کی جائے ۔ ان کی بیوی زیاہ پڑھی لکھی خاتون نہیں ہیں، اگر خط لکھتی بھی ہے تو مختصر اور بدخط اور ان چند سطری ناموں میں بھی شوہر کی وارفتگی کا جواب محبت سے نہیں بلکہ شکایت سے دیتی ہے، لیکن بیوی سے محبت کرنے والے شوہر کے دورافتادہ دل کو ان شکایت بھرے الفاظ سے بھی بوئے محبت آتی ہے اور وہ ان کے لیے بھی اظہار ممنویت کرتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب اس کے دل میں بیوی کی محبت کے جذبات نہ لہلہاتے ہوں اور وہ اس کی صورت دیکھنے کے لیے بے تاب نہ ہوتا ہو، وہ ان کے خطوں کے جواب بھی باقاعدگی سے نہیں دے پاتی، لیکن وہ پھربھی انھیں اپنے علمی منصوبوں سے آگاہ کرتے ہیں مالی امور میں شریک رکھتے ہیں ، لین دین کے حسابات اس پر روشن کرتے ہیں ، ان کے پاس سفر میں کتنے پیسے ہیں وہ کتنے پیسے لے کر چلے تھے ، اب ان کی مالی کیفیت کیاہے ان تمام تفصیلات سے انھیں آگاہ کرتے ہیں۔

ان کی زندگی حوادث اور طوفانوں کاایک غیرمختتم سلسلہ ہے، اخبارکی ضمانتوں کی ضبطی، اخبار کی بندش، مطبع کی ضبطی، حکومت کی تہدیدی چٹھیاں، عدالتوں کے سمن، اسفار کاروبار، ملازمت غرض ان کے مشاغل اور مصروفیات گوناگوں ہیں انھی حالات میں وہ جب بھی اپنی اہلیہ سے جداہوتے ہیں تواسے محبت بھرے خطوط کے ذریعے سے یاد رکھتے ہیں ،کبھی اس کے لیے چائے کاچاندی کاسیٹ خریدتے ہیں ،جس کی بابت انھیں یقین ہے کہ بیوی اسے دیکھ کر خوش ہوجائے گی، اور کبھی اس کے لیے خوب صورت اور کشادہ گھر کی صورت گری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

خطوط ظاہر ہے جدائی کے عالم میں لکھے جاتے ہیں اور ظفرعلی خان کی یہ جدائی ان

کے اسفار کے باعث ہے۔ یہ خطوط کراچی، دہلی، بربرہ (سومالی لینڈ) بمبئی، لندن اور سفرلندن کے دوران جہاز سے لکھے گئے ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۰۲ء سے شروع ہوتے ہیں۔۱۹۰۲ء میں ظفر علی خان کی ازدواجی زندگی نو برس کے شب رو روز دیکھ چکی تھی اور ۱۹۱۴ء تک اس میں مزید بارہ برسوں کا اضافہ ہو چکا تھا، آخری دستیاب خط بمبئی سے لکھا گیا جو غالباً ۱۹۳۸ء کا ہے۔ ظفر علی خان نے خود کو ایک خط کے آخر میں بندۂ محبت لکھا ہے اور ایک خط میں اپنی نسبت یہ شعر ارقام کیا ہے:

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے(۲)

اکیس برس کی ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود بیوی کے لیے ایسے جذبات محبت کا اظہار انھیں واقعی بندۂ محبت ثابت کرتا ہے۔

ان خطوط سے ظفر علی خان کے جذبات کا اظہار نثر میں ہو رہا ہے، وہ ایک بے مثال بدیہ گو اور کلاسیکل ادب سے پر نظر رکھنے والے شاعر ہیں توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ان خطوط میں اشعار کا استعمال ظاہر کرتے لیکن حیران کن حد تک یہ خطوط اشعار سے معرّیٰ ہیں۔ ہم نے اس خیال سے ان کے شعری مجموعوں کی سیر کی کہ بیوی سے جدائی کے زمانے میں کہی گئی منظومات میں، ان کے ان دنوں کے جذبات کا نقش تلاش کیا جائے تو ان کی نظم ''غریب الوطن شاعر کا خطاب اپنی بیوی سے جو وطن میں ہے'' (۳) نگاہیں میں ٹھہر گئیں۔ آپ بھی دیکھیں:

غریب الوطن شاعر کا خطاب اپنی بیوی سے جو وطن میں ہے:

بزمِ دل میں جس کے روشن شمعِ یادِ یار ہو
ہے اُسے سب ایک ویرانہ ہو یا گلزار ہو
کس لقب سے یاد تجھ کو اے مری بی بی کروں
مونس و ہمدم کہوں دلبر کہوں جاناں کہوں

تیری عصمت کی قسم تیری محبت کی قسم
لوحِ دل پر ہے ترے احساں کا نقشہ مرتسم
غم کدہ میرا ترے ہونے سے عشرت خانہ ہے
تیری پیاری پیاری صورت زینت کاشانہ ہے
تو چراغ منزل امید ہے میرے لیے
تو خدائے پاک کی تائید ہے میرے لیے
دیکھ کر دل میں تری تصویر روح آسا کو میں
بھول جاتا ہوں غم دنیا و مافیہا کو میں
ہے جھلک تیرے رُخِ انور کی اس میں جلوہ گر
جو دل آرا ہے ترا اور ہے مرا لخت جگر
اس کی آنکھوں میں چمکتی ہے وہ نورانی کرن
تیری چشم نرگسیں جس کا ہوا پہلا وطن
یہ کرن ان بادلوں کو بھی ہے چمکائے ہوئے
میری پیشانی پہ ہیں جو آج کل چھائے ہوئے
ولولہ اُلفت کا جب ہوتا ہے دل میں جوش زن
آدمی کے لب پہ آ جاتا ہے نامِ عقل و زن
جس طرح اپریل کی گرمی میں مرجھاتے ہیں پھول
گرتے ہی شبنم کے لیکن تازہ ہوجاتے ہیں پھول
ویسے ہی وہ دل کیا غم نے جسے تاراج ہو
صبر کا، تسکین کا، امید کا، محتاج ہے
رحمت اس کی روح پر جس کا ہے یہ قولِ مبیں

ہے صدائے باز گشت آوازِ ارواح بریں
ہے ندا جن کی جواب ان خاکیوں کی بات کا
جن سے تھا اُن کو تعلق اس جگہ دن رات کا
اے مری پیاری ! گراں ہے تجھ پہ گریہ خاک واں
اور ہے تجھ کو تمنائے حیاتِ جاوداں
اس سے پہلے جب کہ میرا طائر روحِ حزیں
اس قفس کو چھوڑ کر تجھ سے ملے آ کر وہیں
میں یہی الفاظ دہراتا رہوں گا بار بار
جانِ من جانانِ من سو دل سے ہوں تجھ پر نثار
تاکہ اوپر سے اٹھا دے تو نقابِ راز کو
اور تسکیں پاؤں میں سن کر تری آواز کو

اس مرحلے پر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مولانا ظفر علی خان کی ازدواجی زندگی کسی رومانی تعلق کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ ایک خالص روایتی Arranged Marriage تھی ، بلکہ روایتی سے بھی کچھ بڑھ کر اس لیے کہ ان کی شادی بقولِ خود ''بارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی۔ جب بیوی گھر میں آئی تو میں ایک مدت تک یہیں سمجھتا رہا کہ یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہے۔'' (۴)

خاندانی روایت کے مطابق جب ظفر علی خان نے لوئر مڈل کا امتحان دیا تو اسی اثنا میں شادی کا واقعہ پیش آ گیا، اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ ظفر علی خان کے دادا جب سیالکوٹ میں مقیم تھے تو ان کی اپنے پڑوسی سے دوستی ہوگئی اور وہ اس کی بیٹی کو اپنی بچیوں کی طرح چاہنے لگے اور کسی جذباتی لمحے میں یہ کہہ دیا کہ میرا پوتا ہوگا تو اسے بہو بناؤں گا۔ جب ظفر علی خان کی عمر دس برس ہوئی تو اس بچی کے والد یعنی مولوی کرم الٰہی کے پڑوسی دوست، نے مولوی صاحب کو یہ بات یاد کروائی ، مولوی کرم الٰہی نے اپنے سعادت مند بیٹے مولوی سراج الدین احمد سے یہ بات

کی۔ پہلے پہل مولوی سراج الدین نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن پھر باپ کا احترام فیصلہ کن ثابت ہوا تاہم مولوی سراج الدین احمد نے یہ دو شرائط رکھیں: (الف) بچے کے سامنے اس رشتے کا ذکر نہ کیا جائے (ب) شادی کے بعد ظفر علی خان کو میرے بہنوئی (فاطمہ بیگم کے شوہر راجہ عبداللہ خان جو مہندر کالج پٹیالہ میں پروفیسر تھے) کے پاس بھیج دیا جائے۔

ان شرائط پر شادی ہوگئی لیکن درحقیقت مولوی سراج الدین احمد اس شادی کے حق میں نہیں تھے، وجوہ بہت واضح تھیں، بچی کی عمر اٹھارہ برس تھی جب کہ ظفر علی خان اپنے مضمون کے مطابق بارہ برس اور خاندانی روایت کے مطابق دس برس کے تھے۔ ابھی ان کی تعلیم بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اور اس کم سنی میں ان پر شادی کی ذمہ داریوں کا بار ڈالنے کا نتیجہ ان کے تعلیمی مستقبل کی تاریکی کی صورت میں نکل سکتا تھا، پھر بچی معمولی پڑھی لکھی تھی، اس کے والد عمر دین لکڑی کے ٹھیکے دار تھے اس لیے ان کے گھر کا ماحول تعلیمی نہیں رہا ہوگا۔ مولوی سراج الدین احمد ہماری مشرقی روایات کے مطابق ان تمام تر تحفظات کے باوصف اپنے والد کے حکم سے سرتابی نہ کر سکے اگرچہ انھوں نے بعد ازاں اپنی ڈائری میں لکھا: ''میں نے اپنے باپ کی فرماں برداری میں یہ ایک قربانی دی ہے۔'' (۵) یہ ایک ایسی شادی تھی جسے دولھا سے مخفی رکھ کر انجام دیا گیا تھا، خاندانی روایات یہ بھی ہے کہ کم سن پوتے نے گھر میں شادی کی تیاریاں ہوتے دیکھیں تو دادا سے فرمائش کی کہ مجھے بھی شادی میں ہمراہ لے چلیں چنانچہ انھیں ساتھ لے جایا گیا لیکن لڑکے کی طرف سے ایجاب وقبول لڑکے کے وکیل بن کر بزرگوں نے کرلیا، لڑکی ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوکر سسرال آ گئی لیکن ساتھ ہی دولھا کو پٹیالہ بھجوا دیا گیا۔ مولوی سراج الدین احمد کا خیال تھا کہ لڑکے کو بی۔اے سے پہلے شادی کا علم نہیں ہونا چاہیے، جب وہ گھر پر ہی نہیں رہے گا تو تعلقات زنا شوئی کیوں کر رکھ سکے گا، چنانچہ شادی کے ساتھ ہی ظفر علی خان کو پٹیالہ بھیج دیا گیا جہاں سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ دوران تعلیم وہ جب کبھی گھر آتے اور ایک نئے فرد کو گھر میں موجود پاتے تو اس پر

تعجب ظاہر کیا کرتے ۔ والدہ کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ میں نے اپنی تنہائی کی وجہ سے اپنی سہیلی کی بیٹی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں جب ظفر علی خان بی۔اے کے سال اول کا امتحان دے کر گھر آئے تو ان پر اپنے شادی شدہ ہونے کا راز منکشف ہوا(۶) چنانچہ بی۔اے کی ڈگری تو انھیں ۱۸۹۵ء میں ملی لیکن چھ دسمبر ۱۸۹۴ء کو جب انھیں بی اے سال دوم میں کامیابی کی اطلاع ملی تو اسی روز وہ ایک فرزند کے والد بن چکے تھے جس کا نام اختر علی خان رکھا گیا۔

آج کے معاشرتی منظرنامے میں یہ سب کچھ بہت عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے لیکن بچوں کی شادی کے حوالے سے ہمارے پرانے بزرگوں کی روش اور زاویہ ہائے نظر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ سب کچھ ناممکن نہیں۔

جس لڑکی سے مولانا کی شادی کی گئی اس کا نام حاکم بی بی تھا، یہ لڑکی اپنے دادا سسر یعنی مولوی کرم الٰہی خان کی چہیتی تھی ، شاید انھیں یہ نام پسند نہیں آیا ہوگا چنانچہ انھوں نے اپنی اس لاڈلی بہو کا نام بدل کر برکت بیگم رکھ دیا، ممکن ہے حاکم نام سے انھیں اپنے پوتے کے محکوم ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا ہو، چنانچہ انھوں نے بہو کی آمد کو باعثِ برکت سمجھتے ہوئے اس کا نام ہی برکت بیگم رکھ دیا۔ آنے والے صفحات میں پیش کیے گئے غیر مطبوعہ خطوط انھی برکت بیگم کے نام ہیں اور ان خطوط کے ذریعے مولانا ظفر علی خان کی زندگی کا یہ پہلو پہلی بار منظرِ عام پر آرہا ہے۔

(ایک)

کراچی

۴/اکتوبر ۱۹۰۲ء (؟)

میری جان

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں وقتاً فوقتاً تم کو خط لکھتا رہوں گا مگر وعدہ پورا نہ ہوا۔ اس لئے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ محفوظ علی(۷) کو البتہ میں خط لکھتا رہا ہوں اور میری

خیریت کی خبر ان کی زبانی تم کو معلوم ہوتی رہی ہوگی۔

(؟) پہنچ کر میں پیچش میں مبتلا ہوگیا اور اس لئے آٹھ دن تک مجھے وہاں رہنا پڑا، ایک جلاب بھی لیا تھا اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔

کتابیں (۸) خوب بک رہی ہیں، آج کی ڈاک میں پچاس روپے حالی، محفوظ علی کو خرچ کے لئے بھیجے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ گھر میں خرچ کی ضرورت ہو تو دینا اور باقی جلد ساز کو دے دینا۔

یہاں سے اورنگ آباد (۹) اور اورنگ آباد سے بمبئی (۱۰) جاؤں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ بمبئی سے تمھارے لئے سونے کی چوڑیوں کی ایک جوڑی بنواتا لاؤں۔ اسی لئے تمھیں روپیہ نہیں بھیجا۔

تمھیں اگر خط لکھنا ہو تو لکھ کر محفوظ علی کو بند کرنے کے بعد دے دو۔ انھیں میرا پتہ معلوم ہے مجھے مل جائے گا۔

میں کل اورنگ آباد جاؤں گا۔

اختر (۱۱) کا میری طرف سے منہ چومنا اور جناب والدہ صاحبہ کو دست بستہ سلام کہہ دینا۔ امید ہے کہ تم سب لوگ خیریت سے ہوگے۔

تمھارا

ظفر

یہ خط محفوظ علی کے نام کے خط میں بند کر کے بھیجتا ہوں وہ اندر پہنچا دیں گے۔

(دو)

دہلی

۷/جنوری ۱۹۰۳ء

میری جان

ایک خط تم کو کل بھیج چکا ہوں جو اس سے پہلے پہنچے گا۔ آج ایک صاحب مولوی

عبدالخالق کے ہاتھ اپنے ٹین کے صندوق میں آٹھ روپیہ کا میوہ اور مٹھائی تم لوگوں کے لئے بھیجتا ہوں ۔ کھاتے وقت مجھے بھی یادرکھنا۔ اور چیزیں سوائے سیب اورانگور کے ایسی ہیں جو زیادہ عرصہ تک رکھے رہنے سے بگڑیں گی بھی نہیں۔

کل یہاں سے روانہ ہوکر بدایوں (۱۲) جانے کا ،محفوظ علی کے ہمراہ، قصد ہے، وہاں دو تین دن رہوں گا اوراس کے بعد اندور کے رستہ سے واپس حیدرآباد آؤں گا اورپہنچ کر دربار (۱۳) کے کُل حالات تم کو سناؤں گا۔

والدہ صاحبہ سے سلام کے بعد کہہ دو کہ ان کے لئے میں نے ایک تسبیح خریدی ہے ۔جو اسی صندوق میں بند ہے اورتولیہ میں ایک کونے کی طرف لپٹی ہوئی ہے ۔اختر کا میری طرف سے منہ چومنا اوراس سے کہنا کہ یہ مٹھائی اورمیوہ میں نے اسی کی خاطر سے خرید کر بھیجا ہے۔

تمھارا

ظفر

(تین)

بمبئی ۹/اکتوبر ۱۹۰۳ء

میں نے پربھنی سے تم کو خط لکھا تھا وہاں سے اورنگ آباد گیا اور اورنگ آباد سے بمبئی آیا۔ رخصت میری ختم ہوگئی ہے اس لیے آج ایک مہینے کی رخصت کی اور درخواست بھیجی ہے۔ مبلغ دوسوروپے کے نوٹ رجسٹری کرکے محفوظ علی کے نام بھیجتا ہوں ۔محفوظ علی نے مجھ کو لکھا ہے کہ ریذیڈنس والا بنیا نوٹس دینے والا ہے کہ میرا روپیہ ادا کردو ورنہ نالش کردوں گا ۔خیر جب میں آؤں گا تو دیکھا جائے گا تم کچھ گھر کا خرچ چلاؤ اور باقی روپیہ سنبھال کررکھو ۔ان شاء اللہ اور کتابیں بھی بکنے کی ہیں۔ میں نے اورنگ آباد سے دس روپے کا منی آرڈر غلام حیدر (۱۴) کے نام لاہور بھیج دیا ہے۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں دست بستہ آداب قبول ہو۔ اور سب خیریت ہے اختر کا میری طرف سے منہ چومنا۔

تمھارا

ظفر

(چار)

بربرہ۔ ۱۰ر مئی (۱۹۰۶ء)

جان سے پیاری برکت

اس وقت تک کہ مجھ کو تم سے بچھڑے ہوئے دو مہینے ہونے کو آتے ہیں (۱۵) تم نے اپنے ہاتھ سے مجھ کو ایک سطر بھی نہیں لکھی اختر کو میں ہر ہفتہ خط لکھتا ہوں اور ہر خط میں تمھاری خیریت اور صحت مزاج کی خبر پوچھ بھیجتا ہوں لیکن مولوی اختر صاحب ایسے حضرت ہیں کہ اول تو خط کا جواب ہی نہیں دیتے اور اگر خط لکھتے بھی ہیں تو ایسا مختصر کہ دو چار سطروں سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس میں بھی مطلب کی بات بہت کم ہوتی ہے تم کبھی کبھی مجھ سے کہا کرتی ہو کہ جتنی محبت مجھ کو تم سے ہے تم کو مجھ سے اوس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ لیکن محبت کا یہ اچھا ثبوت ہے کہ اپنی صحت اور خیریت کی خبر تک اپنے ہاتھ سے نہ لکھو۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ میں تمھاری ناسازی مزاج کی وجہ سے اتنی دور بے تاب اور بے چین ہوں۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب خدا کے واسطے ہر ہفتہ مجھے لمبا چوڑا خط لکھا کرو۔ اور اوس میں ذرا ذرا سی بات لکھ دیا کرو۔ میں خدا کے فضل سے اب بالکل اچھا ہوں تین وقت خوب پیٹ بھر کر روٹی کھاتا ہوں، دس دس بارہ بارہ میل پیدل چل لیتا ہوں۔ محفوظ میری جس قدر خاطر تواضع کرتا ہے اور جس قدر میرے ساتھ اچھی طرح سے پیش آتا ہے اوس کے شکریہ کے لیے میرے پاس کافی لفظ نہیں۔

بھائی کو بھی مجھ سے وہ محبت نہ ہوگی جو اس کو مجھ سے ہے۔ خدا کرے ہمارے اور اس کے تعلقات اسی طرح عمر بھر تک قائم رہیں بلکہ اور بھی زیادہ گہرے ہو جائیں جیسا کہ تم اکثر خواہش کیا کرتی ہو۔ جب میں بمبئی میں تھا تو محفوظ کا ایک خط جو اس نے مجھے حیدرآباد کے پتے سے لکھا تھا، حیدرآباد ہوتا ہوا مجھے بمبئی میں ملا۔ اس میں ایک حصہ مضمون تمہاری مزاج پرسی کے متعلق بھی تھا اور تمھاری صحت کی دعا مانگنے کے بعد اس میں یہ لکھا تھا کہ تمھارے واسطے

ایک سو روپیہ بھیجا جاتا ہے تاکہ گھی کھا کر اچھی طرح سے تندرست ہوجاؤ۔ یہ روپیہ چونکہ بمبئی کے ایک سوداگر کی معرفت میرے نام بھجا تھا اور میں اس خط کے ملتے ہی روانہ بربرہ ہوگیا لہٰذا روپیہ واپس آیا مگر واپسی پر پھر اختر کے نام محفوظ نے بھیج دیا ہے جو تمھارے ایک مہینے کے خرچ کو کافی ہوگا اس سے تم سمجھ سکتی ہو کہ اس کو میرا اور تمھارا کتنا خیال ہے، اوس کے یہ احسان ایسے نہیں کہ ہم اتار سکیں لیکن یہ تمام احسان ہمیں دل میں جمع کر کے رکھ لینے چاہییں۔

میں نے اپنی رخصت میں چار مہینے اور بڑھوائے ہیں جس میں سے ایک مہینہ ختم ہوگیا ہے، تین مہینے رہ گئے ہیں، جب یہ ختم ہوجائیں گے تو واپس آؤں گا۔دو سال کی رخصت جو مجھ کو پچاس روپے ماہوار کے حساب سے ملی ہے، اس سے مجھ کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے پچاس روپے ماہوار الاؤنس کے علاوہ رخصت کے پہلے دس مہینوں میں تین مہینے تک سو سو روپیہ اور سات مہینے تک پچاس پچاس روپے تنخواہ کے ملیں گے۔گویا دو سال میں کل ایک ہزار آٹھ سو پچاس روپے تنخواہ ملیں گے۔ جو تمھارے دو سال کے خرچ کو خواہ تم حیدرآباد میں رہو۔ خواہ بدایوں میں (اس کا فیصلہ تمھاری رائے پر منحصر ہوگا) کافی ہوں گے۔ میں اپنا تعلیم کا خرچ جس طرح سے ہوسکا ادھر ادھر سے نکال لوں گا۔(۱۶)

عبدالرحیم وکیل کا ترجمہ تھوڑا سا رہ گیا ہے، کتاب ختم کر کے ان شاء اللہ اگلے ہفتے کل ترجمہ تمھارے پاس بھیج دوں گا، منشی کو ترجمہ دے کر اس سے یہ کہہ دینا کہ پہلے تین سو روپے وکیل سے رکھوالے۔ اور بعد کو ترجمہ دے۔ اس تین سو میں سے (اگر وصول ہوجائیں) ایک سو منشی کو دے دینا، اس کا ہم پر ڈرامے کی چھپائی (۱۷) کے حساب میں شاید ڈیڑھ سو کے قریب باقی ہے۔ٹھیک رقم معلوم نہیں۔منشی کے حساب کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

مولوی عبدالغنی کو شاید پچھتر کتابیں (ڈرامے کی) بیچنے کی غرض سے دی تھیں، اگر وہ آگئے ہوں تو منشی سے کہنا ان سے روپیہ وصول کرلائیں۔ نظیر بیگ سے کتابوں کا ایک سو ستر روپیہ وصول کرنا ہے میں نے تین خط بھیجے کہ روپیہ اختر کے نام بھیج دے لیکن نظیر بیگ نے کوئی جواب نہیں دیا اگر چھوٹی بیگم حیدرآباد میں ہوں تو ان سے مل کر کہو کہ نظیر بیگ سے روپیہ منگوادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی اس وقت ہم کو روپیہ کی بڑی ضرورت ہے۔

میں نے عبدالحق کو آج لکھا ہے کہ ہر ہفتہ آکر اختر کا امتحان لیا کرے اگر مناسب سمجھے تو اپنے پاس لے جاکر ملک میں رکھے تمھاری رائے میں اگر مناسب ہو اسے بھیج دو۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں دست بستہ آداب قبول ہو۔ اختر کو پیار۔ اگلی ڈاک میں ایک سو روپیہ تمھارے نام نوٹ کے ذریعے سے پہونچے گا۔

تمھارا

ظفر

محفوظ علی بدایونی کا مختصر پیغام بیگم ظفر علی خان کے نام

بہن صاحبہ اور جنابہ چچی صاحبہ کو بہت بہت سلام۔ اس خط میں جو کچھ ظفر نے لکھا ہے اگرچہ اس کا بہت سا حصہ اور خصوصاً وہ حصہ جو میری محبت اور اپنی آسائش کے متعلق لکھا ہے، غلط ہے۔ مگر اس قدر صحیح ہے کہ خدا کے فضل سے اون کی صحت اب اچھی ہے۔ خدا کرے آپ بھی تندرست ہوں۔

آپ کا بھائی

محفوظ

(پانچ)

بربرہ
۲۹ رمئی ۱۹۰۶ء
پیاری برکت

آج اختر کے خط سے حُسنا کے (۱۸) ناگہانی انتقال کی خبر سن کر نہایت رنج ہوا، بے چاری کا چھوٹے چھوٹے دودھ پیتے بچے چھوڑ کر جوان مرجانا سخت دل ہلا دینے والا واقعہ ہے ۔ غلام حیدر کو جو صدمہ پہنچا ہوگا اس کا اندازہ تم اچھی طرح سے کرسکتی ہو۔ میں نے آج اسے ماتم پرسی کے طور پر ایک خط لکھا ہے اور تشفی دلاسا دینے کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ بچوں کی خبر گیری کے لئے تمھاری بہن موجود ہے جو ماں کی طرح ان کی پرورش کرے گی۔تم خود اپنے ہاتھ سے ایک خط اسی مضمون کا اس کو لکھ دو اور بچوں کو اپنے پاس بلوا بھیجو۔اگرچہ والدہ صاحبہ وہاں موجود ہیں لیکن مناسب یہی ہے۔

خدا کی شان، اکبر جوان مرگیا اور صفو (صغریٰ؟) بیوہ رہ گئی(۱۹) اب حُسنا مرگئی اور غلام حیدر اکیلا رہ گیا۔

اس میں بھی خدا کی کوئی خاص مصلحت ہوگی۔

ظفر

(چھ)

جہاز پرشیا۔۳ راگست ۱۹۰۶ء
پیاری برکت

عدن سے روانہ ہونے کے دن میں نے اپنی روانگی کی اطلاع بذریعہ تار تمھیں دی تھی، امید ہے کہ یہ تار تمھیں اسی دن پہنچا ہوگا۔کل صبح کے نو بجے ہم ان شاء اللہ بمبئی پہنچ جائیں گے۔ پانچ چھ دن وہاں ٹھہرنے کا قصد ہے کیونکہ بہت سے کام کرنے ہیں، جس دن حیدرآباد روانہ ہوں گا تو تار دوں گا۔(۲۰)

چونکہ یہ زمانہ برسات کا ہے اس لیے سمندر میں طوفان ہے، جہاز ڈگیانے کی وجہ سے سر میں چکر آتے رہتے ہیں، ایک ہفتہ سے برابر طبیعت خراب ہے کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ آج

کسی قدر اچھا ہوں اور تمھیں خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ بمبئی پہنچ کر ان شاء اللہ طبیعت درست ہوجائے گی۔ امید ہے کہ تمھارا مزاج بہ فضل خدا اچھا ہوگا۔ اختر کو پیار

تمھارا

ظفر

(سات)

The Deccan Review
A high class urdu monthly
devoted to literature

Time's Building
Hornby Road
Bombay 25th October 1906 (21)

جان سے پیاری برکت

آج ایک سو روپیہ کے پانچ بیس بیس روپیہ والے نوٹ رجسٹری کے ذریعہ سے تمھارے نام بھیجتا ہوں۔ جس دن میں چلا تھا تو ستر روپے بینک سے نکلوا کر اور پچپن روپیہ صاحب جنگ (؟) کے ہاں سے لاکر گویا کل ایک سو پچیس روپیہ حالی تمھیں میں دیتا آیا تھا۔ اس ایک (ناخوانا) روپے کے ایک سو پندرہ حالی ہوئے گویا کل دو سو چالیس روپیہ تمھارے پاس آئے۔ میں پانچ اکتوبر کو چلا تھا۔ جو بیس دن ہوتے ہیں۔ اس روپیہ میں تمھیں تین مہینے کا خرچ کم از کم چلانا چاہیے یعنی اکتوبر، نومبر اور دسمبر۔ جنوری کے مہینے میں ان شاء اللہ اور روپیہ بھیجا جائے گا۔

نواب نصراللہ خان (۲۲) نے ابھی تک روپیہ نہیں دیا لیکن امید ہے کہ دو مہینے میں جب اس کا بھتیجا گدی پر بیٹھے گا تو دو ہزار روپیہ مجھے مل جائے گا۔

اختر کا ابھی بمبئی آنا مناسب نہیں۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوگیا ہے۔ میں، خدا نے چاہا تو عید گھر آکر کروں گا اور اس وقت اسے اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔

بجائے نوٹوں کے منی آرڈر بھیجا جاتا ہے۔

ظفر

(آٹھ)

لندن

۱۳ کراسفیلڈ روڈ

سوئس کاٹیج

۱۵ مئی ۱۹۱۳ء (۲۳)

پیاری برکت

شکر ہے کہ تم کو بھی میرے نام خط لکھنے کی توفیق ہوئی۔ اختر کا خط جو پچھلے ہفتہ کھولا تو ایک کاغذ نظر پڑا جس پر چند مکوڑے چلتے ہوئے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو تمہارے پیارے ہاتھوں کے چند دل فریب نشان تھے جن کے چوم لینے کی ابھی تک اپنے دل میں جگہ پاتا ہوں ۔ اگر چہ کبھی کبھی جب آئینہ کو دیکھتا ہوں تو بالوں میں ایک آدھ جگہ سفیدی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اور کہتی ہے کہ عشق و محبت کے لئے جوانی چاہیے۔ بہر حال ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری منہ پھاڑے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ضمانت اور مطبع کی ضبطی (۲۴) کی فکر سے خدا خدا کر کے کسی قدر چھٹکارا ہوا تھا کہ پنجاب گورنمنٹ کی ایک چٹھی جس میں غصہ اور غضب کا زہر رہ کرا گلا گیا ہے بلائے ناگہانی کی طرح سر پر آنازل ہوئی۔ اب یہاں اس کا توڑ کر رہا ہوں ۔ اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کے حملوں سے بچنے اور اُن کے جوڑ توڑ کا جواب دینے کے لئے مجھے سال کا ایک بڑا حصہ لندن ہی میں گزارنا پڑا کرے گا۔ عجب نہیں کہ یہاں سے انگریزی اخبار نکالنے پر مجھے مجبور ہونا پڑے۔(۲۵) میں یہ ارادہ کر رہا ہوں کہ گرمی کے دو تین مہینے یہاں گزار کر اکتوبر میں حج کرتا ہوا لاہور واپس ہوں۔ اس عرصہ میں وہ کالے بادل بھی جو سر پر گھرے ہوئے ہیں چھٹ جائیں گے اور مطلع صاف ہو جائے گا۔

جس مکان میں وہاں ہم رہتے ہیں وہ ہماری ضرورتوں کے لحاظ سے بہت تنگ ہے

اور ایک نہ دو اکٹھے تین کنبے اس میں آرام و آسائش کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتے ۔ میں چاہتا ہوں کہ بالا خانہ غلام حیدر اور والدہ صاحبہ کے لئے چھوڑ دیا جائے اور ہم شہر کے کسی قدر دور یعنی جہاں گرد و غبار نہ ہو اور جہاں کی آب و ہوا بھی اچھی ہو ایک کوٹھی لے کر رہیں ۔ تم اختر و غلام حیدر کے ہمراہ جا کر کوئی کوٹھی جس کے ساتھ باغ بھی ہو اور جس کا کرایہ ستر روپیہ ماہوار ہو پسند کرلو(۲۶) اور اُس میں اٹھ جاؤ ۔ کوٹھی میں سامان (از قسم فرنیچر) عمدہ قسم کا ہونا چاہیے ۔ اس کے لئے تم ایک ہزار روپیہ تک خرچ کر سکتی ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب میں آؤں تو تم اس کوٹھی کو آراستہ کر چکی ہو اور میں سیدھا اُس میں آسکوں۔ حقیقت میں یہ بات نہایت ہی تکلیف دہ اور ساتھ ہی بدزیب معلوم ہوتی ہے کہ ہم موجودہ مکان میں مسافروں کی طرح سے زندگی بسر کریں۔ ایک ہی کمرہ میں کھائیں ، اُسی میں بیٹھیں ، اُسی میں سوئیں اور اُسی میں مہمانوں کے لئے گنجائش نکالیں۔ اس لئے کہ ساتھ کے دو کمرے اس قدر چھوٹے ہیں کہ اُن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

گاڑی اس وقت تک بن کر تیار ہوگئی ہوگی۔ اس کے لئے اچھی سی جوڑی تلاش کراؤ۔ قیمت اس میں شک نہیں کہ زیادہ ہوگی لیکن چیز تو اچھی مل جائے گی۔ (۲۷) میں سستی چیزوں کا قائل نہیں ۔ مثل مشہور ہے ''مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار''۔

میں یہاں سے تمھارے لئے چاء کا ایک چاندی کا نہایت خوبصورت سِٹ خرید کر لاؤں گا ۔ جسے دیکھ کر تم خوش نہ ہو جاؤ تو میرا ذمہ

ظفر

(نو)

پیاری برکت

شکر ہے کہ ایک سطر مدتوں کے بعد تم نے بھی لکھی۔ اگر چہ اس ایک سطر میں چند لفظ تھے اور یہ لفظ شکایتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان شکایتوں سے بھی میرے دور افتادہ دل کو

بوئے محبت آتی تھی۔ اس لئے تمھارا ممنون ہوں۔ اگر ہر ہفتہ الٹا سیدھا ایک خط لکھ دیا کرو تو مجھے اس پردیس میں کتنا سہارا ہوگا۔

اختر کی صحت کی طرف سے سخت پریشان ہوں ۔خدا کے لئے اس کے علاج میں کوتاہی نہ کرو جس قدر خرچ اس پر ہو، ہونے دو۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء ظفر

(دس)

۱۴/مئی ۱۹۲۴ء

عزیز از جان

تمہارا خط ملا ۔ جملہ حالات سے آگاہی ہوئی۔ چودھری اللہ دتا (۲۸) کے فرزند کے انتقال کا بہت افسوس ہے لیکن اس دنیا میں یہ حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں بھی ایک قیامت خیز حادثہ ہوگیا۔ خان صاحب عبدالغفور خان صاحب کا نوجوان فرزند ۸مئی کو دن کے ۸ بجے عین عالمِ شباب میں بعمر ۲۹ سال اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا۔

مرحوم حمید خان ایک لایق گریجویٹ، ایک کامیاب وکیل، ایک ہردلعزیز میونسپل کمشنر اورسب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور نیک اطوار نوجوان تھا۔ اس کے مرنے کا رنج یہاں کے ہرچھوٹے بڑے کو ہے اور جو صدمہ اس کے ناشاد والد اورتفتہ جگر بی بی کو ہوا ہوگا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ خوب کرسکتے ہیں جن پر ایسی اوراتنی بڑی مصیبت کا پہاڑ (یکا) یک ٹوٹ پڑا ہو۔

مرحوم نے دو اولادیں چھوڑیں ہیں ایک تو ساڑھے چارسال کا بچہ اورایک تین سال کی لڑکی۔

خدا مرحوم کو اپنے جوارِ مغفرت میں جگہ دے اور اس کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل بخشے۔

مہر صاحب (۲۹) اسی لحاظ سے ایک موزوں نوٹ ''زمیندار'' کی سب سے قریبی اشاعت میں درج کردیں۔

منصور صاحب (۳۰) کی بڑی عنایت ہے کہ سیر کو جانے کے لئے میری رہائی کا انتظار فرمارہے ہیں۔

فقط

ظفر علی خان

(گیارہ)

۱۴/مئی ۱۹۲۹ء

پیاری برکت

دو ہفتے ہوئے ایک خط تمھیں لکھا تھا۔ اختر نے تمھیں دیا ہوگا۔اب تو میں تمھاری صورت کو ترس گیا ہوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ تمھارا پیارا خیال نہ آتا ہو۔ میرا آنا اکتوبر تک ہوگا۔ اس لئے کہ میں اس مرتبہ حج کرنا چاہتا ہوں۔ مقامِ شرم ہے کہ دو دو بار لند ن آؤں اور مکہ مدینہ نہ جاسکوں۔

میں نے تم کو لکھا تھا کہ اپنے رہنے کے لئے شہر سے کسی قدر فاصلہ پر جہاں کی آب وہوا اچھی ہو، جگہ مرطوب نہ ہو ایک کوٹھی کرایہ پر لے لو۔ میرے آتے تک اس کا تمھیں انتظام کررکھنا چاہیے۔ ہمارا موجودہ مکان حقیقت میں بہت ہی تنگ اور مختصر ہے اور ہماری ضروریات اس میں پوری نہیں ہوسکتیں۔

ظفر

(بارہ)

بمبئی

۱۸ستمبر (۱۹۳۸ء.....؟) انجمن اسلامیہ بمبئی

پیاری برکت

میرے منماڑ (۳۱) (؟) سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچنے کی خبر تو تم کو اس خط سے معلوم ہو ہی چکی ہوگی جو محفوظ علی نے اختر کے نام بمبئی سے ہمارے یہاں پہنچتے ہی روانہ کیا تھا۔ یہاں آنے کے دوسرے روز مجھے بخار آیا اور ساتھ ہی سخت سر کا درد ہوا۔ میں نے فقط یہ علاج کیا کہ گرم پانی کرا کر اور اس میں نمک ڈلوا کر کئی گلاس بھر بھر کر پیے اور قے کر ڈالی۔ اس سے طبیعیت ہلکی ہوگئی۔ اور دوسرے ہی دن مزاج صاف ہوگیا۔ اب بہ فضلِ خدا اچھا ہوں۔

نصراللہ خان سے ملا اور تمام کیفیت کہہ سنائی۔ باقی دوسری تجویزیں کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ سب معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔ تفصیلی حالات زبانی آ کر کہوں گا۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر واپس آؤں گا۔

اختر کو پیار

اختر کو میری طرف سے دعا۔ بہن صاحبہ کو سلام

ظفر

☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱۔ دیکھیے مکتوب نمبر ۸ مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء از لندن

۲۔ مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محل اور مکتوب بنام آغا شورش کاشمیری در مکاتیب ظفر علی خان مرتبہ زاہد منیر عامر لاہور سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء، صص ۱۷۵، ۱۵۷

۳۔ خیالستان مطبوعہ مکتبہ کاروان لاہور، س۔ن

۴۔ آپ بیتی ظفر علی خان مرتبہ محمد عبداللہ قریشی در نقوش آپ بیتی نمبر لاہور ادارۂ فروغ اُردو

۵۔ نظیر حسنین زیدی، مولانا ظفر علی خان احوال و آثار، لاہور، مجلسِ ترقی ادب ۱۹۸۶ء، صص ۳۷۔۳۹

۶۔ ریحانہ خاتون ظفر علی خان کی غیر مطبوعہ تحریریں، مقالہ برائے ایم۔فل اُردو اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۲۔۱۹۹۳ء

۷۔ ان تمام مکتوبات میں محفوظ یا محفوظ علی سے ، سید محفوظ علی بدایونی (۸ر مئی ۱۸۷۰ء ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۳ء) مراد ہیں۔

۸۔ یہ خط ۱۹۰۲(؟) میں لکھا گیا اس وقت تک ظفر علی خان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی تھیں: سیر ظلمات (۱۹۰۰ء) جنگل میں منگل (۱۹۰۱ء) اور خیابان فارس (۱۹۰۲ء) لیکن اس زمانے میں جو کتاب زیادہ فروخت ہو رہی تھی وہ کرزن کی کتاب کا ترجمہ خیابانِ فارس تھا۔

۹۔ اورنگ آباد میں ظفر علی خان کے قریبی دوست اور ہم جماعت مولوی عبدالحق

(ہاپوڑ ۱۸۷۰ء۔کراچی ۱۹۶۱ء) کا گھر تھا۔

۱۰۔ بمبئی اس زمانے کا اہم تجارتی اور تہذیبی شہر، ظفر علی خان نے بعدازاں یہاں سے دکن ریویو بھی نکالا۔

۱۱۔ اختر علی خان (م:۱۷/ اکتوبر ۱۹۵۸ء) فرزند مولانا ظفر علی خان آئندہ بھی اختر سے مراد اختر علی خان ہی ہیں۔

۱۲۔ بدایوں، سید محفوظ علی بدایونی کا وطن تھا۔

۱۳۔ مراد ہے ریاست حیدرآباد دکن کے دربار کے حالات، جہاں ظفر علی خان سلکِ ملازمت میں منسلک تھے۔

۱۴۔ ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر خان مرحوم

۱۵۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ظفر علی خان مارچ ۱۹۰۶ء میں بربرہ پہنچے ہوں گے۔

۱۶۔ اس پیراگراف میں ظفر علی خان کی رخصت اور تنخواہ سے متعلق نہایت اہم معلومات ہیں لیکن یہ واضح نہیں کہ وہ کون سی تعلیم اور اس کے اخراجات کا ذکر کررہے ہیں۔ کیونکہ ان کی تعلیم تو ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوچکی اور اس کے بعد ان کا کوئی سلسلہ تعلیم ہمارے علم میں نہیں۔

۱۷۔ مراد ہے ظفر علی خان کی کتاب جنگ روس و جاپان جو بربرہ جانے سے قبل شائع ہوچکی تھی۔

۱۸۔ مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر خان کی بیوی

۱۹۔ ظفر علی خان کے سب سے چھوٹے بھائی اکبر علی خان جن کی یاد میں انھوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا ر۔ک بہارستان ' لاہور؛ مکتبہ کاروان ۔س۔ن

صفو اکبر علی خان کی بیوی کا نام تھا۔

۲۰۔ یہ خط ۳؍اگست ۱۹۰۶ء کو جہاز پر شیا سے لکھا گیا جس کے ذریعے وہ عدن سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور پانچ دن یہیں ٹھہر کر حیدرآباد جانے کا ارادہ رکھتے ہیں گویا یہ ان کی بربرہ سے واپسی کا سفر ہے۔ اگر مارچ ۱۹۰۶ء میں بربرہ جانا مانا جائے تو بربرہ میں ان کا کل قیام پانچ ماہ بنتا ہے۔

۲۱۔ وہ یہیں آ چکے اور بربرہ میں بنائے گئے منصوبوں پر عمل کے پہلے قدم کے طور پر بمبئی سے دکن ریویو جاری ہو چکا جس کے لیٹر پیڈ پر یہ خط لکھا گیا ہے۔

۲۲۔ معلوم نہیں یہ کون صاحب ہیں۔

۲۳۔ یہ ظفر علی خان کا پہلا سفر لندن ہے، جو زمیندار پریس کی ضبطی اور زمیندار کی بندش کے بعد، جب یہ توقع نہیں تھی کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے گا، اختیار کیا گیا۔ اس سفر کے دوران میں انھوں نے انگریزی کتابچہ The Indian Press Act لکھا اور پریس ایکٹ کے خلاف مہم چلائی۔

۲۴۔ گویا جس مصیبت سے بچنے کے لیے انھوں نے لندن کا سفر اختیار کیا تھا اس نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

۲۵۔ ظفر علی خان کے اس ارادے کا اظہار اس خط سے پہلی بار ہو رہا ہے، اس کے علاوہ ان کی زبان، قلم سے اور کہیں اس ارادہ کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ انگریزی اخبار تو وہ نہ نکال سکے البتہ ایک زمانے میں زمیندار کا ایک صفحہ انگریزی میں شائع ہوتا رہا۔

۲۶۔ گویا اب مالی حالات بہتر ہو گئے ہیں۔

۲۷۔ ظفر علی خان کی نئی گاڑی ان کے مخالفین کی طرف سے ان پر بدگمانیوں کا موجب بنی۔ ظفر الملک علوی نے کتاب الاشرار میں لکھا: ''حیدرآباد کی درباداریوں مسخرگیوں اور مطرب ادائیوں

میں اور زندگی کی دیگر دلچسپیوں میں کافی وقت گزر جانے کے باوجود ظفر علی خان نے چند ہی سال میں تراجم کا ایک معقول ذخیرہ فراہم کر دیا، اور یہ کوشش ان کی بہر طور قابل قدر تھی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ ءفطری بھی اپنے عمل سے غافل نہیں رہا جو اس محنت شاقہ کا محرک اصلی تھا یعنی روپیہ بٹورنے (جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسبابِ معیشت کے بآسانی و فراوانی مہیا کرنے کے واسطے) کی کوششیں بھی برابر جاری رہیں۔ خیابان فارس سے اس میں خاص امداد ملی کیونکہ کشور ہندوستان کے گورنر جنرل کی کتاب کوئی معمولی چیز نہ تھی، ہندوستان کی کوئی ریاست بلالحاظ قومیت و مذہب ایسی نہ تھی جس نے اس علمی خدمت کا اعتراف اس کی جلدوں کی کافی تعداد خرید کر کے نہ کیا ہو۔ یہی کتاب مترجم کو فرماں روائے ریاست بھوپال کے دربار تک لے گئی اور بارگاہِ سلطانی سے مالا مال لائی۔ دوسرے سال پھر حاضری ہوئی۔ اب کے ایک پرزور قصیدہ بھی پڑھا گیا جس کے صلے میں ولایت جا کر فن و بلاغت کی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر مبلغ دو ہزار روپیہ رئیسہ بھوپال نے عطا فرمائے، ولایت کا سفر تو اس وقت ایک جملہ ءمعترضہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اہل حیدرآباد نے دیکھا ہوگا کہ اس کے بعد ہی ان کی پرانی پالکی گاڑی نئی فٹن میں تبدیل ہوگئی۔ مگر ریاست بھوپال خوش قسمت تھی کہ اس چھاپے کے بعد پھر کبھی ظفر علی خان نے اودہر کا رخ نہیں کیا۔'' (ص ۱۷۔۱۸)

۲۸۔ برکت بیگم کے بہنوئی، کھیتی باڑی کرتے تھے، سیالکوٹ سے ہیڈمرالہ کی طرف معظم آباد نامی گاؤں میں رہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان شکار کے لیے اکثر ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں تقسیم کے بعد لاہور میں مولانا ظفر علی خان کے گھر انتقال ہوا۔

۲۹۔ مولانا غلام رسول مہر

۳۰۔ منصور علی خان فرزند اکبر اختر علی خان

۳۱۔ منماڑا کا سفر ۱۹۳۸ء میں کیا گیا جیسا کہ منماڑ میں کہی گئی نظم سے جس پر ۲۲/جون ۱۹۳۸ء کی تاریخ درج ہے۔ دیکھیے: چمنستان ص ۱۸۵ اس پر ذیل کا نوٹ بھی درج ہے ''بمبئی سے مالیگاؤں اور اٹولا اور منماڑ ہوتے ہوئے جب میں بہ قصدِ مراجعت پنجاب ریل پر سوار ہوا تو منماڑ کی طرف منہ کر کے اُسے ان الفاظ میں مخاطب کیا:

کہہ رہا ہے یہ ہر اک ذرہ خاک منماڑ
اے مسلمان اُٹھ اور پرچم دیں ہند میں گاڑ
میں نے مانا کہ بلاؤں نے ہے گھیرا تجھ کو
اور ترے سر پہ معلق ہیں مصیبت کے پہاڑ
دیکھتے دیکھتے افغان کی فطرت بدلی
کانگرس جا کے بنا آئی پٹھانوں کو کراڑ
صدقہء رحمتِ شاہِ دو سرا میں لیکن
آج بھی بند نہیں تجھ پہ عزیمت کے کواڑ
حیدرآباد دکن سے درۂ خیبر تک
شورِ تکبیر مچا اور درِ خیبر کو اُکھاڑ
اے کہ مرحب فگنی تیری روایات میں ہے

مسولینی کو مسل پاؤں میں، ہٹلر کو پچھاڑ
اے کہ توحید کا گس بل ہے ترے بازو میں
کشورِ دیں کو بسا کفر کی نگری کو اُجاڑ
دیکھ کر برہمن و شیخ کو میں کیوں نہ کہوں
ایک یہ ہے کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہے جسے تصویر بنا آتی ہے

منماڑ ۔۲۲۔جون ۱۹۳۸ء

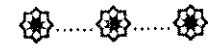

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 31 - 66

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

ابن الرومی، ایک شاعر ایک تاریخ

مسز زریں۔ ایس ریاض ☆

Abstract:

The rich classical Arabic literature has great tradition of poetic excellence. Even before the spread of Islam, the land of Hijaz produced so many extraordinary epics and this tradition was well followed during the Islamic era. Ibn Al Rumi was a famous and renowned poet of Abbasids period. He belonged to a family of Greek origion but his expertise in saying Arabic verses is beyond any doubt. One of his Qasidas contained even more than three hundred verses.

Key words: Arabic poetry, Abbasids period, Ibn Al Rumi

دوسری صدی ہجری کے وسط میں ایک رومی (یونانی) شخص حلقہ بگوش اسلام ہوا جس کا نام غریغورس (۲) یا جورجیس تھا۔ اس نے عبیداللہ بن عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی کے ہاتھ پر بیعت کی اور بنو عباس کے موالی میں شامل ہو گیا۔ پھر اس کا نام جاج یا جریج ہو گیا یہ جریج اپنے اصلی وطن کی مناسبت سے ''الرومی'' کے نام سے مشہور تھا۔

☆ شعبہ علوم اسلامیہ، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

جرتیح الرومی کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام عباس رکھا (۲) یہ نام اس خاندان کی مناسبت سے رکھا جس میں وہ بحیثیت غلام داخل ہوا تھا۔ جب عباس جوان ہوگیا تو اس نے ایک ایرانی الاصل عورت سے شادی کر لی جس کا نام حسنہ تھا اس کے دولڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک کا نام 'محمد' اور دوسرے کا نام 'علی' رکھا گیا۔ یہ علی بعد میں عرب کے فحول الشعراء میں شمار ہوا۔

علی ابن العباس (ابن رومی)(۲) رجب ۲۲۱ھ (مطابق ۲۱ جون ۸۳۶ء کو بروز چہار شنبہ طلوع فجر کے بعد بغداد میں عیسیٰ بن جعفر بن المنصور کے محل کے نزدیک ایک مشہور مقام عقیقہ کے ایک گھر میں پیدا ہوا۔(۳) (عقیقہ کو دربِ ختلیہ بھی کہتے ہیں)

ابن الرومی عبداللہ بن عیسیٰ بن جعفر بن منصور کا غلام تھا اور جعفر منصور کا دوسرا بیٹا تھا جسے نہ تو حکومت و ولایت ملی تھی نہ ہی اس کی اولاد میں سے کسی کو حکومت حاصل ہوئی تھی اسی خاندان میں ابن الرومی نے پرورش پائی۔

ابن الرومی نے بذاتِ خود اپنے رومی الاصل ہونے میں کبھی شک نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے دیوان میں مختلف مقامات پر اپنے رومی الاصل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتا ہے۔(۴)

و نحن بنو الیونان قوم لناحجیٰ   ومجد و عید ان صلاب المعاجم

''ہم یونان کے فرزند ہیں ہم لوگ بڑے دانا بزرگی والے اور صبر والے ہیں''

اور یہ شعر (۵)

قد تحسن الروم شعرا   ماأحسنته العریب

اہلِ روم شعر کہنا خوب جانتے ہیں   جیسے اہلِ عرب کہہ سکتے ہیں

پھر کہتا ہے(۶)

آبائی الروم توفیل و توفلس ولم یلدنی ربعی ولا شیث

میرے آباؤ اجداد رومی توفیل اور توفلس تھے ربعی اور شیث سے میں پیدا نہیں ہوا۔

اسی طرح ابن الرومی کا یہ شعر بھی اس کے رومی الاصل ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔(۷)

اذا الشاعر الرومی أطریٰ أمیره فناهیك من مطریٰ و نا هیك من مطر

''جب رومی شاعر اپنے امیر کی تعریف کرتا ہے تو تعریف کرنے والا اور تعریف کیا گیا دونوں تعریف کے مستحق ہوتے ہیں''

ابن الرومی نے تمام زندگی بغداد میں گزاری ۸ وہ اگر کسی دوسرے علاقہ میں جاتا تو بہت کم عرصہ کے لئے اور پھر واپس اپنے شہر میں آ جاتا اس کے دل میں بغداد کے لئے بے انتہا محبت و رغبت تھی۔ جیسا کہ وہ خود ہمیں بتاتا ہے۔

بلد صحبت به الشبیة والصبی و لبست فیه العیش و هو جدید

'' وہ ایک ایسا شہر ہے کہ جس میں مَیں لڑکپن اور جوانی کا ساتھی اور زندگی کا لباس اس وقت پہنتا تھا جبکہ وہ نیا تھا''(۹)

ہمارے پاس یہ باور کرنے کے لئے وجوہات ہیں کہ اس وقت اس کا خاندان متوسط درجہ کی خوشحالی میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں جلدی ہی اجاگر ہوگئی تھیں

ابن الرومی نے سلیمان عبداللہ بن طاہر کے لئے جو قصیدہ لکھا اس میں اپنی وطن پرستی کا یوں ذکر کرتا ہے۔(۱۰)

ولی وطن آلیت ان لا ابیعه وأن لاأریٰ غیری له الدهر مالکا

''میرا بغداد میں ایک جدی مکان ہے جس کے متعلق میں نے قسم کھائی تھی کہ کسی کے ہاتھ نہ بیچوں گا اور نہ کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں دوں گا''

اس کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو عربی و ایرانی تاریخ سے کچھ واقفیت تھی لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا اس کا علم اپنے زمانے کے عام تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں کے سرسری علم سے زیادہ تھا یا نہیں وہ بہت سے تاریخی اشخاص، روائتی گھوڑوں اور دیگر جانوروں کا ذکر درمیان میں لاتا ہے۔ مثلاً حاتم، قارون، اور داحس کا ذکر کرتا ہے ان کے علاوہ وہ اوروں کا ذکر بھی کرتا ہے جسے شبیب اور الحجّاف کا ،گھوڑوں میں رخش اور شبدیز جو اس زمانے میں مسوپوٹیمیا میں زیادہ مشہور تھے جب کہ اس نے یہ نظمیں لکھیں'ابن الرومی کے علمِ جغرافیہ کے حوالے طنجہ و افرنجہ تک گھومتے ہیں لیکن ان میں مقامات کے ناموں کا شاذ ہی ذکر ہوتا ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جو اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے ان مقامات میں عرب کے پہاڑوں کی بھی کافی تعداد ہے ۔ ابن الرومی، امری القیس ، النابغہ ذبیانی اور لبید کی شاعری سے واقف ہونے کا اظہار کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ایک دو اشعار کا حوالہ بھی دیتا ہے وہ زہیر، الاخطل ، الفرزدق، جریر، البعیث ، ابونواس اور دعبل کی نظموں کا بھی ذکر کرتا ہے۔

ابن رومی نے اپنے باپ کا ذکر اپنے دیوان میں بہت کم کیا ہے البتہمند رجہ ذیل اشعار میں وہ اپنے ماں باپ کی برتری کا اظہار کرتا ہے۔

كيف أغضى على الدنئية والفرس خوؤلى والروم أعمامى[۱۱]

''میں کس طرح دناءت پر صبر کرسکتا ہوں جبکہ ایرانی میرے ماموں اور رومی میرے چچا ہیں''

چونکہ اس کے دادا کا نام جرتج یا جورجیس ہے جو ایک یونانی نام ہے اس لئے اس کی اصلیت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ ابن الرومی نے بچپن ہی سے اپنے لئے ابن

الرومی عرف پسند کر لیا تھا۔

ابن الرومی آل رسول ﷺ سے بہت محبت کرتا تھا اس نے ان کی مدح میں بے شمار قصائد کہے[۱۲] ابن الرومی نے جو مرثیہ یحیٰ بن عمرو کے لئے لکھا تھا اس میں خاندان علی کی پرزور مدح کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الرومی کو شیعہ کہا جاتا ہے۔ (یحیٰ بن عمرو عباسیوں کے خلاف اٹھا تھا اور انہوں نے اسے قتل کروا دیا تھا) [۱۳] اس امر کے متعلق المعری کی رائے ہے کہ ابن الرومی نے دوسرے شعراء کا اندازِ فکر اختیار کیا تھا۔

وما اراہ الا علیٰ مذھب غیرہٖ من الشعراء و من اولع بالطیرۃ [۱۴]

علاوہ ازیں ابن الرومی کا شیعہ فرقہ کے ساتھ تعلق رکھنے کا اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا میل جول ان کے سرگرم ارکان کے ساتھ خاص طور پر ابو سہل کے ساتھ جس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ میں اس کے ساتھ مذہب کے رشتہ میں منسلک ہوں۔ لیکن اس سب باتوں کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ ابن الرومی نے المعتضد سے بلا کسی تردد کے کہہ دیا کہ مجھے آل رسول اکرم ﷺ کی میراث حاصل ہے۔ (۱۵)

رجع الملك جديداً كالذى كان فى بدأته حين طَلع

''سلطنت اسی طرح لوٹ آئی ہے جیسے شروع میں تھی''

حالانکہ اس کا یہ بیان شیعہ اندازِ فکر کے خلاف ہے اس کے اس رویہ کی وضاحت میں یہ بھی ممکن مانا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہو۔ پھر ابن الرومی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک کٹر معتزلی ہوں۔

أأرفض الا عتزال رأياً . كلاّ لأنى به ضنينٌ [۱۶]

''کیا میں اعتزال کو ٹھکرا دوں ہرگز نہیں میں تو اس کے بارے میں بڑا بخیل ہوں''

قاضی یوسف کے سامنے لگائے گئے لا مذہبیت کے الزام کے متعلق ہمیں صرف اس کی پیش کردہ صفائی کا پتہ چلتا ہے الزام کی دیگر تفاصیل نہیں ملتیں۔ وہ پرزور الفاظ میں قاضی صاحب سے کہتا ہے۔

یشھدُالله انَّ دینی دین　　　یرتضیهِ شهادةُو مغیبا

لم اعاندبهِ الطریق ولا　　　اضحیٰ لدین المعاندین نسیبا ۱۷؎

''اللہ جانتا ہے کہ میرے مذہبی عقائد، خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وہی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں میں نے اپنے عقیدے میں نہ تو صراطِ مستقیم کو چھوڑا ہے اور نہ ہی گمراہیوں کا راستہ اختیار کیا ہے''۔

نسلِ انسانی کے دوسرے افراد کی طرح ایک فنکار بھی اسی زمین پر رہتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی کاوشوں میں دنیا سے کتنا ہی الگ ہونے کی کوشش کرے پھر بھی وہ دنیا ہی کا فرد ہوتا ہے معاشی مشکلات کو انہیں کی طرح سلجھاتا ہے اور اجتماعی نفسیات کا غلام ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کچھ آگے بڑھ کر دیکھ لے لیکن حدودِ زمان و مکان کو توڑ کر روحِ عصر کو ٹھکرا نہیں سکتا۔اس کی کوششوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے زمانے کے میلانات سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔وہ سیاسی جبروت اور معاشی گرفت سے دامن بچا کر نکل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے فنکار اپنی تخلیقی قوتوں کے باوصف اپنے عصری رجحانات میں محصور رہے اگر ایسا نہ کرتے تو ان کی آوازیں مبہم اور ان کے کارنامے مہمل ہو کر مٹ جاتے۔

درحقیقت ہر فن اپنے عہد کی تہذیب و تمدن کی آئینہ داری کے لئے مجبور ہے اور اسی مجبوری کا فیض ہے کہ ہم بعض قدیم عمارات اور پرانے نقوش دیکھ کر اس عہد کی تہذیب کا اندازہ کر لیتے ہیں۔اسی طرح شعر و ادب اپنے عہد کی سماجی زندگی کا ترجمان ہے اور پابند بھی

۔وہ زندگی کے مرکز سے تمام شعبوں پر نظر ڈالتا ہے لیکن نہ اپنے مرکز کو چھوڑ سکتا ہے نہ زندگی کے کسی ایک شعبے میں استغراق بڑھا سکتا ہے۔ الغرض شاعری سماجی روایات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور شاعر جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اور جس تہذیب و تمدن کی گود میں سانس لیتا ہے اس سے اس کا گریز ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے کسی شاعر کی روح کو سمجھنے کے لئے اس عہد کے ماحول کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ عباس محمود عقاد نے تیسری صدی ہجری جو ابن الرومی کا عہد تھا کے بارے میں یوں گوہر افشانی کی ہے۔

كان أحسن الازمان و كان أسواالأزمان كان عصر الحكمة و كان عصرالجهلة كان عهد اليقين والايمان وكان عهد الحيرة والشكوك كان او ان النور و كان أو ان الظلام ء كان ربيع الرجاء و كان زمهريرالقنوط بين أيدينا كل شئ وليس بين ايدينا أى شئ وسبيلنا جميعا الىٰ سماءٍ عليينو سبيلنا جمياً الى قرار الجهيم تلك أيام كأيامنا هذهٖ التى يوصينا الصاحبون من ثقاتها أن نأخذهاعلىٰ علاتها وألاتذكرها الا بصيغة المبالغةفيمااشتملت عليه من طيبات ومن اٰفات ۱۹

جس قدر خلفاء کا زمانہ ابن الرومی نے دیکھا اتنے خلیفہ کسی بھی شاعر کے عہد میں نہیں ہوئے۔ ابن خلکان کی روایت کے مطابق ابن الرومی ۲۲۱ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۲۸۳ھ میں وفات پا گیا اور اپنے اس مختصر عرصۂ حیات میں اس نے نو خلفاء کا دور خلافت دیکھا۔ یعنی معتصم ، واثق، متوکل، منتصر، مستعین، معتز، مھتدی، معتمد اور معتضد، مؤخر الذکر شاعر کی وفات کے چھ سال بعد مرا۔(۲۰)

جب ہم ان خلفاء کی زندگیوں پر نظر کرتے ہیں اور ان کی حیات سیاسی کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام بڑا خراب ہوا۔ مثلاً متوکل قتل کیا گیا۔ مستعین ، معتز اور مھتدی

نے خلع کیا اور اس کے بعد قتل کر دیئے گئے۔ معتمد اور معتضد زہر دے کر مار دیئے گئے جو باقی رہے وہ اپنے تختِ خلافت پر ہی مرے تو ان کا زمانہ بھی فتنہ وفساد اور خارجی بغاوتوں سے خالی نہ تھا اور کسی نے بھی خلافت وحکومت کا صحیح لطف نہیں اٹھایا۔

معتصم نے اپنی آٹھ سالہ مدتِ خلافت اندرونی اور بیرونی مخالف طاقتوں کا قلع قمع کرنے میں صرف کی۔ جس طاقت نے بھی سر اٹھایا اسے کچل کر رکھ دیا عموریہ کی فتح اس کا سب سے بڑا جنگی کارنامہ ہے۔خطیب کا بیان ہے کہ اس نے آٹھ ملک فتح کئے اور آٹھ دشمنوں کو مغلوب کیا۔(۲۱) سیوطی نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں آٹھ فرمانروا امیر ہوئے جس کی مثال کسی خلیفہ کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ (۲۲)

معتصم نے اپنے بھتیجے عباس بن مامون کی بغاوت کو فرو کیا۔۲۳ عرب سردار معتصم کی ترک نوازی سے بہت برہم ہوگئے تھے۔ جس زمانہ میں معتصم عموریہ کی مہم میں مشغول تھا انہوں نے عباس بن مامون کو بھڑکا کر اس کے خلاف کھڑا کر دیا اور معتصم نے اشناس اور افشین کو قتل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ (۲۴) معتصم کو اس کی خبر ہوگئی اور وہ قسطنطنیہ سے واپس آ گیا عباس کو گرفتار کر کے قید کر دیا ور عباس کچھ دنوں کے بعد قید ہی میں مر گیا۔ خلیفہ معتصم کی فوج میں ترکوں کی بھر مار ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ اہل بغداد ان سے تنگ آ گئے تھے۔(۲۵) ترک فوجیوں اور اہل بغداد کے درمیان جھگڑے ہونے لگے تھے۔ ان مخاصمات کے درمیان ابن الرومی پیدا ہوا اگر ابن الرومی بحیثیت شاعر بغداد میں ترکوں کے زمانہ کو پا لیتا تو وہ اس کی ہجو سے بچ نہ سکتے۔ جیسا کہ ''دعبل'' نے ان کی ہجو کی ہے اور وہ کہتا ہے۔

لقد ضاع أمرالناس حيث ليسوسهم

''وصيف'' و ''أشناس'' و قد عظم الخطب (۲۶)

''لوگ برباد ہو گئے جب سے کہ ان پر حکومت کرتے ہیں وصیف و اشناس اور یہ کتنی بڑی مصیبت ہے''

جس زمانہ میں ابن الرومی بچہ تھا ترک لشکری بغداد کی گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے اور جب وہ لڑکپن کی عمر کو پہنچا تو خلیفہ معتصم نے ان کو مدینہ سے سامرا منتقل کر دیا'' (۲۷)اور وہ خود بھی وہیں رہنے لگا بعد میں خلیفہ معتصم کو احساس ہوا کہ اس نے ترکوں کو اقتدار دے کر اپنے اوپر اور عباسی خلافت پر ایک بڑا خطرہ مسلط کر لیا ہے۔ ان کا بغداد یا سامرا میں قیام اس کے لئے اور اس کی رعایا دونوں کے لئے باعث تکلیف ہے۔ معتصم نے ایرانیوں اور ترکوں کی خدمت کا موازنہ کیا تو ایرانی بڑھے ہوئے تھے۔ ادھر ایرانیوں اور ترکوں میں اقتدر کے لئے جدوجہد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ واثق بن معتصم خلیفہ بنا۔ واثق معتصم سے بھی زیادہ ترک نواز تھا اس لیے اس کے خلیفہ ہونے کے بعد ترکوں کو اور زیادہ عروج حاصل ہوا۔

ان کو بڑے بڑے مناصب پر فائز کیا اشناس ترکی کو جواہرات کے ہار پہنائے اور سر پر جواہرات کا تاج رکھ کر نائب السلطنت بنایا واثق پہلا شخص ہے جس نے نیابتِ سلطانی کا عہدہ قائم کیا۔ (۲۸)

جب ابن الرومی نے جوانی میں قدم رکھا تو ادھر ترکوں کا اقتدار جوان ہو گیا۔ ایتاخ ترکی کو اتنی قوت حاصل تھی کہ وہ جس کو چاہتا قتل کر دیتا جس کو چاہتا قید کر دیتا بلکہ ایک بار تو اس نے خلیفہ متوکل کو بھی قتل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ (۲۹)مگر متوکل بچ گیا

ایرانیوں اور ترکوں کی سازشیں طول پکڑتی گئیں یہاں تک کہ خلافت و خلیفہ ان کے ان ہتھکنڈوں سے عاجز آ گئے اور آخر کار خلیفہ متوکل نے اپنی خلافت بغداد سے دمشق منتقل کرنے کے بارے میں سوچا۔ تاکہ ترکی عنصر سے فرار حاصل کر کے عربی عنصر کی پناہ لے سکے۔ (۳۰)

متوکل نے اپنی زندگی میں ہی اپنے تین بیٹوں کو ولی عہد بنا کر تمام سلطنت ان میں تقسیم کر دی تھی اور اپنی وفات کے بعد ان تینوں کو اپنی اپنی حدود میں خود مختار قرار دے دیا تھا اور رعایا سے ان کے حق میں بیعت لے لی تھی۔ مگر پھر اس کے بڑے بیٹے محمد منتصر کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور خلیفہ نے اپنے دوسرے بیٹے معتز کو ولی عہد اول قرار دے دیا اس سے رنجش اور بڑھ گئی منتصر نے اپنے باپ کے خلاف ترکوں سے ساز باز کی انہوں نے رات کے وقت شاہی محل میں داخل ہو کر خلیفہ کو موت کی نیند سلا دیا اور خود منتصر خلیفہ بن بیٹھا۔(۳۱)

منتصر کے عہد میں علویوں کو امن ملا۔ ان کی ضبط شدہ جائیدادیں واپس کی گئیں اور شیعانِ علی کو حضرت حسینؓ کے مرقد اور جملہ ال ابی طالب کے مقابر کی زیارت کرنے کی عام اجازت مل گئی۔(۳۲) منتصر ترکوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا ان کے کہنے سے اس نے اپنے دونوں بھائیوں معتز اور مؤید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔۳۳ منتصر کو اس بات کا رنج تھا اور اسے اپنے باپ کے قتل کا بھی دکھ تھا وہ دل سے ترکوں کے خلاف تھا۔ ترکوں کو اس با ت کا علم ہوا تو انہوں نے اس کی بیماری کے درمیان مسموم نشتر سے اس کی فصد کھلوادی اور وہ اس زہر کے اثر سے وفات پا گیا۔منتصر کے بعد ترکوں نے اس کے بیٹے مستعین کو خلیفہ بنا یا ادھر اہل بغداد ترکوں کے مظالم سے تنگ آ کر بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مستعین گھبرا کر بغداد بھاگ گیا۔ ترک اسے سامرالانے کی کوشش کرتے رہے۔وہ نہ مانا تو انہوں نے اسے معزول کر کے دوسرے بیٹے معتز کو خلیفہ بنا لیا۔معتز کو ترکوں کی بدولت خلافت ملی تھی۔لیکن معتز کے دل میں سابقہ رنجش تھی اس لئے اس کا دل صاف نہ تھا۔ اس نے تخت نشینی کے بعد بغاو وصیف اور دیگر ترک افسروں کے نام دفتر سے خارج کر دیئے۔ ترکوں کی جانب سے

اطمینان حاصل ہوا تھا کہ معلوم ہوا موید موالی سے ساز باز کرنے لگا اس لئے معتز نے مؤید اور اس کے بھائی ابو احمد کو قید کر کے ان سے ولی عہدی سے دست برداری کا اقرار لے لیا مؤید قید ہی میں مر گیا۔ پھر اس نے مستعین کو بھی مروا ڈالا۔

معتز کو معزول کر کے ترکوں نے واثق کے بیٹے مھتدی کو تاج وتخت سونپ دیا۔(۳۴) مھتدی بڑا عاقل و مدبر و عاقبت اندیش خلیفہ تھا اس نے چاہا کہ ترکوں کے اقتدار سے جو نظام میں ابتری پھیل گئی ہے اس کی اصلاح کی جائے مگر امراء کی ذاتی اغراض کے باعث اس کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ مھتدی بھی ترکوں کے استبداد کا شکار رہا تخت سے اتار کر بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ مھتدی کی معزولی کے بعد معتمد خلیفہ بنا جو اس وقت قید میں تھا۔ معتمد محض نام کا خلیفہ تھا چھوٹے بڑے کسی معاملےء میں بھی اس کا حکم نہ چلتا تھا۔(۳۵) معتمد کے زمانہ میں ملک کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی ۔ گوشہ گوشہ میں شورش اور ہنگامہ غرض مغرب سے مشرق تک کوئی گوشہ طوائف الملوکی سے خالی نہ تھا۔(۳۶)

معتمد کے عہد خلافت میں ۲۶۰ھ بڑا اہم ہے اس سن میں کئی ایک اہم واقعات رونما ہوئے ۔ اولاً ماوراء النھر میں سامانی خاندان کی ابتداہوئی۔ دوسرے شیعہ امامیہ کے گیارھویں امام ابو محمد حسن عسکری نے سامرا میں وفات پائی۔ ان کے خوردسال بیٹے محمد مہدی اپنے والد کی تلاش میں ایک سراب میں غائب ہو گئے ان پر ائمہ دوازدہ کا سلسلہ ختم ہو گیا ، تیسرے اسماعیلیہ کی دعوت کی ابتداء ہوئی جس سے بعد میں قرامطہ فرقہ پیدا ہوا۔ معتمد کے آخری سال یعنی ۲۷۹ھ میں دولت عباسیہ کا دارالحکومت سامرا سے دوبارہ دارلسلام بغداد منتقل ہوا۔ (۳۷)

خلیفہ معتمد نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی اس کے بعد موفق کے بیٹے معتضد باللہ خلیفہ

مقرر ہوا۔ وہ ترکوں کا کھلونا نہیں بنا بلکہ اس نے تمام سرکش امراء کو زیر کر کے اور مخالف قوتوں کا قلع قمع کر کے عباسی حکومت میں از سرِ نو جان ڈالدی۔ (۳۸)

جس زمانہ میں خلیفہ معتضد حکومت کے ان جھگڑوں اور جنگوں میں الجھا ہوا تھا اور عباسی خلافت دورِانحطاط میں داخل ہو چکی تھی ابن الرومی کا انتقال ہو گیا۔ ابن الرومی کی وفات ۲۸۳ھ میں ہوئی یعنی معتضد کی حکومت کے چار سال بعد۔

ابن الرومی کی پوری زندگی کسی نہ کسی امیر ووزیر خلیفہ اور حاکم وغیرہ کی مدح یا ہجو کرتے گزری کسی سے خوش ہوا تو مدحیہ قصائد کہہ دیئے اور خفگی کی صورت میں ہجو کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا اسی لئے اس کے بے شمار متعلقین اور ممدوحین ہیں۔ آل طاہر بھی انہیں میں سے ہیں۔ آل طاہر جو عباسیوں کے دور میں نیم خود مختار تھے انہوں نے بغداد اور اس کے مضافات پر حکومت کرنے کا حق موروثی بنا لیا تھا اس کے علاوہ ان کی حکومت صوبہ خراسان اور مشرقی حصہ میں خلافت کے دیگر زیر فرمان علاقوں پر تھی۔ طاہری خاندان کا ایک شخص محمد بن عبداللہ بن طاہر تھا جس کو اس کے بھائی نے جو خراسان کا گورنر تھا بغداد کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس وقت ابن الرومی سولہ سال کا تھا اپنے سربراہ کی وفات کے بعد بھی جو کہ ۲۴۸ھ میں ہوئی وہ اس عہدے پر قائم رہا لیکن اب وہ براہِ راست خلیفہ کے ماتحت ہو گیا تھا اسی وجہ سے اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بغداد سے وصول کی ہوئی سالانہ باج کی رقم جو کہ ۱۳۰۰۰،۰۰۰ درہم تھی (ایک کروڑ، تیس لاکھ درہم) خود اپنے اوپر خرچ کر سکے۔ اس سے قبل اس کو یہ رقم نیشاپور بھیجنی پڑتی تھی۔(۳۹) جہاں خراسان کا گورنر رہتا تھا جس کے ماتحت وہ خود تھا پس طاہریوں میں سب سے پہلا وہ گورنر تھا جس کا تعلق ابن الرومی سے رہا ہو اور جس کے ساتھ ابن الرومی کے تعلقات اگر ہمیشہ نہیں تو کسی خاص عرصہ کے لئے انتہائی گہرے رہے ہوں علاوہ ازیں محمد بن

عبداللہ بن طاہر ایک شائستہ آدمی تھا شاعر بھی تھا اور اس کا گھرانہ عالم و فاضل لوگوں کی آماجگاہ تھا۔۴۰ کچھ قصیدے ایسے ہیں جن میں نہایت گھٹیا اور تحقیر آمیز طعنے دیئے ہیں۔ ابن الرومی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سلیمان بن عبداللہ نے المعتز کو برباد کیا تھا اس کے برعکس یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان کا کوئی تعلق خلیفہ کی موت سے رہا ہو جس کو ترک فوج نے سامرا میں قتل کر دیا تھا۔ ابن الرومی کے ایک قصیدہ میں زنگیوں کے بصرہ پر قبضہ کا ذکر ہے۔ اس سے اس وقت کی اسلامی دنیا کے دلی اضطراب کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ایک عظیم ترین شہر کی بے حرمتی سے پیدا ہوا۔

یہ تو معلوم نہیں کہ سلیمان بن عبداللہ کتنا عرصہ بغداد کا گورنر رہا لیکن ۲۵۹ھ میں اس کی جگہ عبید اللہ بن عبداللہ نے لے لی۔ کیونکہ اس سال صفاریوں کے بعد نیشاپور میں یعقوب بن لیث داخل ہوا تھا ور اس نے طاہری گورنر کو قید کر لیا تھا۔(۴۱) اور اس طرح طاہری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور خلیفہ نے عبیداللہ کی گورنری کی تصدیق کر دی تھی۔

ابن الرومی نے عبیداللہ کے لئے بے شمار قصائد کہے ایک بارہ وہ اس کی چالیسویں سالگرہ پر کہتا ہے

لی أربعون من السنین وأربعون من الولد (۴۲)

''میں چالیس سال کا ہوں اور میرے چالیس بیٹے ہیں''

ملك لا یریٰ اللهیٰ تستحق الوسائلا حسب راجیه لدیه انه جاء سائلا (۴۳)

'' وہ ایک ایسا بادشاہ ہے جو اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ تحفوں کے مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جو فن کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کوئی اس سے توقعات پیش کر کے آئے اور مانگے''

دوسرے قصیدہ میں بھی تقریباً اسی زور شور کے ساتھ وہ اس کی کشادہ دلی کے گن گاتا ہے ۔ تیسرا قصیدہ خاص طور پر ایک عرض داشت سے متعلق ہے جس میں ابن الرومی بیان کرتا ہے۔ (۴۴)

ولی وطن آلیت أن لا أبیعه وأن لا أریٰ غیری له الدهر ما لکا

عهدت به شرخ الشباب و نعمة کنعمة قوم أصبحوا فی ظلالکا (۴۵)

''میرا بغداد میں ایک جدی مکان ہے جس کے متعلق میں نے قسم کھائی تھی کہ نہ تو کسی کے ہاتھ بیچوں گا اور نہ اسے کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں دیکھوں گا کیونکہ میں اس مکان سے اپنی جوانی کے عروج کے زمانہ سے مانوس ہوں''

ابن الرومی اپنی بے شمار چھوٹی نظموں میں سلیمان کا مذاق اڑاتا ہے اور تقریباً ان سب میں لڑائیوں میں اس کی شکست کا ہی ذکر کرتا ہے وہ سلیمان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے۔

''هو الأسد الورد فی قصرہٖ ولکنه ثعلب المعرکة (۴۶)

''وہ اپنے گھر میں بھورا شیر ہے لیکن لڑائی میں لومڑی بن جاتا ہے''

ابن الرومی نے اپنی زندگی کا ایک کثیر حصہ سامرا میں گزارا اگرچہ اس رہائش کے دوران اس نے بغداد سے اپنا رشتہ مکمل طور پر منقطع نہیں کیا تھا۔

سامرا کا شہر جہاں پر دربارِ خلافت تھا اور جہاں حکام کی ایک کثیر تعداد اکٹھی ہوگئی تھی ایک شاعر کے لئے بغداد کی نسبت زیادہ امید افزا مقام تھا بڑے بڑے افسروں میں اور خصوصاً وزراء اور حکومت کے مختلف شعبوں کے ناظموں سے اس کو کشادہ دل سرپرست ملنے کی توقع ہوگئی تھی۔

ابن الرومی کی نظموں میں ترکی اور دوسرے فوجی افسروں میں سے کسی ایک کے لئے

ایک بھی قصیدہ نہیں ملتا، اور نہ ہی ان میں سے کسی کی طرف وہ اشارہ کرتا ہے ماسوائے چند سر سری اشاروں کے جن کا ذکر ضمناً آ گیا ہو تاہم ابن الرومی باوجود ان کی غیر فصیح زبان کے ترکوں کی جرأت مندی اور ان کی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا مداح تھا(۴۷) اور اس نے ان کی ان خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا قصیدہ لکھا تھا۔

ترى شبه الا سادفيهم مبيناً ولكنهم ادهى دهاءً وانكر (۴۸)

ان میں شیروں جیسے خواص ہیں مگر وہ بڑے سیاست والے ہیں

اپنے دورانِ حکومت کے اکثر حصہ میں المعتمد ہمیشہ برائے نام خلیفہ رہا ورنہ حکومت دراصل اسکے بھائی الموفق کے ہاتھوں میں رہی(۴۹) الموفق نے حالات پر بڑی جدوجہد کے بعد قابو پایا تھا۔ امور سلطنت یقیناً مکمل طور پر اسی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا کہ بطور خود ایک وزیر کا تقرر کر سکے۔ ۲۶۵ھ میں اس نے صاعد بن مخلد کو اس مرتبہ (وزارت) تک بڑھا دیا تھا لیکن در اصل یہ صرف سیکرٹری کا عہدہ تھا اس سے قبل بھی صاعد بڑے عہدے پر رہ چکا تھا وہ اک عیسائی تھا اس نے اسلام اپنی آخری ترقی کے موقع پر قبول کیا تھا اس کے بھائیوں میں سے ایک بھائی جس کا نام الحسن بن مخلد تھا(۵۰) مختلف اوقات میں المعتمد کا وزیر رہ چکا تھا اس کا ایک اور بھائی عابدون بن مخلد تھا جو ہمیشہ عیسائیت پر قائم رہا وہ بھی بہت با اثر آدمی تھا اور سرکاری عہدیدار تھا صاعد کا بیٹا علاء بھی ایک اہم سرکاری عہدیدار تھا۔ صاعد کے خاندان کا پہلا فرد جس کے پاس ابن الرومی گیا تھا وہ العلاء ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شان میں ایک طویل قصیدہ ابن الرومی کے دیوان میں محفوظ ہے۔اس میں ایک ایسے شخص کے جذبات کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہو گئی ہو۔ اپنی اس تخلیق کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ یہ بہترین شاعری کا نمونہ ہے۔

کفیٰ المرء وعظاً اربعون تفارطت ولو لم یغطه شیبه المتنارط [۵۱]

''انسان کے لئے چالیس سال کی عمر بہترین واعظ ہے اگرچہ ابھی اس کے بال سفید نہ ہوئے ہوں''

ابن الرومی نے العلاء کے ذریعہ اس کے باپ تک رسائی حاصل کی وہ العلاء کے پہلے مدحیہ قصیدہ میں صاعد کو بھی شامل کر لیتا ہے اور اس میں مضحکہ خیز حد تک آگے بڑھ جاتا ہے۔

وکل مدیح لم یکن فی ابن صاعد ولا فی أبیه صاعد فهو حابط

''ہر وہ مدح جو ابن صاعد (العلاء) یا اس کے باپ صاعد کے لئے نہیں ہے فضول ہے''

ایک اور با اثر ایرانی خاندان جس کے ساتھ اس زمانہ میں ابن الرومی کے تعلقات تھے اور شاید ابتداً اسی وقت قائم بھی ہوئے تھے وہ بنی نو بخت تھے جو نعمانیہ میں آباد تھے۔ جس کے نواح میں عباسی خلیفہ دوم نے کچھ زمین ان کو اس بات کے انعام کے طور پر عطا کی تھی کہ انہون نے اس وقت اس کے حق میں ایک حوصلہ افزا پیشن گوئی کی تھی جب کہ اس کے مقدر کے ستارے مدھم پڑھ چکے تھے۔[۵۲] تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اس خاندان کا سربراہ ابوسھل (اسماعیل بن علی) تھا یہ ایک عالم آدمی تھا اور ایک ممتاز ماہرِ الہیات و مصنف تھا کہا جاتا ہے کہ خلفاء کے دفاتر میں اس کا عہدہ وزارت کے بعد تھا۔ ابوسہل شیعوں کے پیشواؤں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا اثنیٰ عشرہ فرقہ کی بنیاد ڈالنے والا بھی اسی کو سمجھنا چاہیے وہ کہتا تھا کہ بارہویں امام روپوش ہیں اور اپنے باردگری منظر عام پر آنے تک روپوش رہیں گے۔(۵۳) ابن الرومی کا طویل ترین قصیدہ اس کے ابوسہل کے قریب آنے کا اولین موقع فرض کیا جا سکتا ہے۔ اس قصیدے میں ابن الرومی اقرار کرتا ہے کہ نعمانیہ میں میں ابوسہل کی شخصیت میں ایک

کرم فرما سے ملوں گا اور وہاں اس کے سائے تلے آرام سے رہوں گا۔ایک قصیدے میں وہ شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے

لا یرانی أهلاً لملك الظهاری ولا موضع العطایا الرغاب ۵۴

'' تو مجھے ان اچھی چیزوں کے قابل بھی نہیں سمجھتا جو کہ گھٹیا اور نا کارہ لوگوں کے تصرف میں ہوتی ہیں''

ایک جگہ وہ ابوسہل پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے پھر گیا ہے اور وظیفہ بند کر دیا ہے۔ ابن الرومی نے چند قصائد ابوسہل کے بھائی محمد بن علی کو بھی خطاب کرتے ہوئے کئے ہیں۔ان میں سے ایک میں اس سے ایک تحفے کا تقاضا کیا ہے جب کہ وہ نعمانیہ کا گورنر تھا۔

طلبت کساءً منك اذا انت عامل علیٰ قریة النعمان تعطیٰ الرغائبا ۵۵

'' میں نے آپ سے ایک خلعت کی طلب کی تھی جب کہ آپ نعمان کے گورنر تھے اور خوب دادو دہش کیا کرتے تھے''

ابن الرومی کے عبداللہ الناشی کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم تھے جو کہ ابوسہل کا شاگرد تھا اور عطاری کا کام کیا کرتا تھا۔ ابن الرومی زندگی کے آخری ایام میں الناشی کی دکان پر مستقلاً بیٹھا کرتا تھا۔(۵۶)

ابن الرومی کے چند قصیدے خود الموفق کو بھی خطاب کر کے لکھے گئے ہیں لیکن یہ امر کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کسی بھی زمانے میں اس شہزادے سے قریبی طور پر متفق رہا ہو۔

ایک قصیدہ جو ایک رسمی سی ثنائیہ نظم اور جو ۲۷۰ھ میں الموفق کے ہاتھوں زنگیوں کی شکست کے بعد لکھی گئی۔جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

شغل المحب عن الرسوم وان غدت مثل الوشوم

'' عاشق محبوبہ کے آثارِ دیار سے غافل ہو گئے اگرچہ وہ آثارِ دیار گودنے کے نشانات

کی طرح ہو گئے ہیں''

اس میں الموفق کے کارناموں کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ ایک تیسرا قصیدہ ہے جس میں کسی ایسے واقعہ کا بیان ہے جس کا مؤرخین نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس میں الموفق کو قسم دی گئی ہے کہ وہ اپنے آدمی ولی کو چھوڑ نہ دے ورنہ وہ خلیفہ کے دوسرے پیروؤں کو اس کے بعد ہمیشہ کے لئے بدخواہ بنا لے گا۔ ابن الرومی کہتا ہے۔

فمن مبلغ عنی موفق هاشم　　قریع بنی العباس ذالمجدو الفخر

''کون میری طرف سے موفق ہاشم کو یہ پیغام پہنچائے گا جو بنو عباس کا صاحبِ مجد و فخر کا سردار ہے''

دوسرے قصیدوں میں (بھی) الموفق کیلئے اور بھی بہت سے واقعاتی اشارات ہیں ان میں سے ایک میں اس کے زنگیوں کے ساتھ جنگ کے طریق کار کے متعلق کچھ مفید تفصیلات ہیں۔ دوسرے قصیدوں میں اس کے ہاتھوں کی گئی بعض عہدوں کی تقسیم کا ذکر ہے جیسے ایک شخص ابو الفوارس کا ذکر جسے کوئی عہدہ سونپا گیا تھا۔

لا بدع ان ضحك القتير　　فبكالضحكته الكبير [۵۷]

''اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ مفلس خوشی سے ہنسا اس کی ہنسی پر ایک بہت بڑا آدمی رویا''

الموفق کی موت کے ایک سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ابو العباس نے المعتمد کے بیٹے کو علیحدہ کر دیا اور اپنے وارثِ تخت و تاج ہونے کا اعلان کر دیا۔ المعتمد کے مرنے کے بعد ابوالعباس خود خلیفہ بن گیا اور المعتضد کا لقب اختیار کر لیا تھا اب عبیداللہ بن سلیمان بن وہب، ابن بلبل کی جگہ وزیر بنا۔

اس زمانے میں جن لوگوں سے ابن الرومی کا تعلق تھا ان میں سے ایک احمد بن محمد الطائی تھا یہ وہ ہستی تھی جس کو ۲۶۹ھ میں کوفہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس نے یہ عہدہ دوسرے بہت سے اختیارات کے اضافہ کے ساتھ اس وقت تک سنبھالے رکھا جب وہ ۲۷۵ھ میں گرفتار ہوا ۵۸ الطائی پر جلد ہی نوازشات بحال ہوگئی ہوں گی کیونکہ المعتضد کی حکومت کے آغاز کے وقت وہ بغداد کے نزدیکی چند اضلاح کو زیر کاشت لا رہا تھا جس کے بدلے میں وہ خزانہ کو روزانہ رقم خطیر ادا کرتا تھا۔۵۹ وہ بے ایمانی سے قرامطہ تحریک کی حمایت کرتا تھا یہ ایسے کہ وہ قرمطی مذہب اختیار کرنے والوں سے ان کے وجود کو برداشت کرنے کے صلے میں رقمیں اینٹھتا تھا۔(۶۰) ابن الرومی نے جو پہلا تعریفی قصیدہ الطائی کے لئے لکھا وہ ایک طویل قصیدہ ہے۔ اس سے قبل ابن الرومی نے ایک قصیدہ اس کے خلاف لکھا تھا وہ اس لئے کہ اس نے ایک اہل کار کے بیٹے کو اس وقت بطور یرغمال پکڑ لیا تھا جب کہ اسے اس بات کا خطرہ تھا کہ اس پر ابن بلبل کی وزارت کے زمانے میں حملہ نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ ۲۷۳ھ یا اس کے قریبی دور کا ہے اس کے بعد غالبًا المعتضد کی حکومت کے زمانہ میں الطائی نے ابن الرومی کا وظیفہ مقرر کرنے کا وعدہ کر لیا ہوگا۔

ابن الرومی کے دیوان میں خود المعتضد پر کوئی بیس قصائد ہیں ان میں سے کوئی بھی طویل نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر مبارک بادی قصائد ہیں جو المعتضد کو مختلف موقعوں پر پیش کی گئی تھیں۔ ایک المعتضد کی ۲۸۲ھ میں طولونی شہزادی قطر الندیٰ کے ساتھ شادی ہونے کے موقعہ پر لکھا گیا۔ ایک المعتضد کی تخت نشینی ،جشن عید الفطر وغیرہ پر لکھے گئے۔ ایک مرثیہ والدہ کی وفات پر لکھا۔

ابن الرومی کے عباسی خاندان کے دو اور افراد کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم تھے ان

میں سے ایک تو عبدالملک بن صالح تھا ابن الرومی اس کے لئے اپنی پر خلوص محبت کا اقرار کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

فعلی قدر ذاك اسأل حاجا تی و امتاحها بغیر احتشام

''میں اس سے جو بھی چاہتا ہوں بغیر کسی شرم کے مانگ سکتا ہوں''

ایک اور جگہ اقرار کرتا ہے

اذا ما نباعنی الوزیر و انتم عتادی فلم من رجاکم من تحرما

''اگر وزیر میرے کام نہ آئے اور عبدالمالک تو میری حمایت پر قائم رہے تو میں سمجھوں گا کہ کچھ نہیں بگڑا''

ایک اور عباسی شخص تھا جس کا نام عیسیٰ ابن موسیٰ ابن التوکل تھا ابن الرومی نے اپنے تین چار قصیدوں میں اس کی طمع کا مذاق اڑایا ہے(۶۲)

یقتر عیسیٰ علی نفسهٖ ولیس بباق ولا خالدٖ

فلو یستطیع لتقتیرهٖ تنفس من منخر واحدٖ

عذر ناه أیام أعدایهٖ فما عذرذی بخل واجدٖ

رضیت لتفریق أموالهٖ یدی وارثٖ لیس بالحامدٖ

''عیسیٰ باعتبارِ ذات ایک کمینہ شخص ہے اس کو نہ بقا ہے نہ دوام''

''وہ اتنا کمینہ ہے کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک ہی نتھنے سے سانس لیتا''

''اگر اس کے پاس کچھ نہ ہوتا تو ہم اس کو معذور سمجھتے مگر ایک دولتمند بخیل کے پاس کیا عذر ہے''

''مجھے اس کی دولت کے بکھر جانے کی خوشی ہے اس کے وارثوں کے ہاتھوں جو اس

کی تعریف کرنے والے نہیں''(۶۲)

ابن بلبل کی معزولی کے بعد ابن الرومی کے مربیٔ خاص بنی وہب تھے۔ یہ خاندان ابتداً واسط سے تعلق رکھتا تھا یہ لوگ امویوں کے زمانہ سے حکومت کی ملازمت میں چلے آرہے تھے اور حکومت کے لیے ڈیڑھ سوسال سے زیادہ کی مسلسل خدمات کا دعویٰ کر سکتے تھے۔۶۳ اس خاندان کے افراد جن کا ذکر ابن الرومی اپنے قصائد میں کرتا ہے وہ سلیمان بن وہب اس کے تین بیٹے احمد، وہب اور عبیداللہ اور عبیداللہ کے دو بیٹے الحسن اور القاسم ہیں۔

سلیمان کے تین بیٹوں میں سے ایک احمد شاعر و مصنف تھا وہ سرکاری ملازمت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا اور ۲۸۵ھ میں مر گیا۔۶۴ اس کا دوسرا بیٹا وہب ۲۶۰ھ میں سرکاری ملازم تھا اور ۲۸۰ھ کے لگ بھگ بھی وہ بقید حیات ہی تھا۔سلیمان کے تیسرے بیٹے عبیداللہ بن سلیمان کو جلد ہی اہم سرکاری ملازمت مل گئی تھی وہ ترکی سردار موسیٰ بن بغا کا سیکرٹری تھا۔ بعد ازاں وہ الموفق کا سیکرٹری بنا۔

عبیداللہ کے بیٹے الحسن کو بھی بہت سے سرکاری عہدوں پر مقرر کیا گیا وہ ایک عالم آدمی تھا اس نے اقلیدس کی شرح لکھی تھی ۲۸۴ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔۶۵ اس کا دوسرا بیٹا القاسم بھی سرکاری ملازم تھا وہ بڑا تند مزاج اور ظالم تھا اس سے بہت سے قہر انگیز جرائم سرزد ہوئے تھے ان میں سے ایک جرم احمد بن الطیب کا قتل بھی تھا۔ نیز عمرو بن لیث کا قتل یہ سب اس کی مجرمانہ ذہنیت کی مثالیں ہیں وہ تیس سال کی عمر میں ۲۹۱ھ میں مر گیا۔(۶۶)

ابن الرومی نے بہت سے قصیدے پورے وہب خاندان کو مخاطب کر کے لکھے ہیں۔ جن میں ان کی مدح وتعریف ہے لیکن کہیں کہیں شکایت بھی ہے۔

مضت سنون أراعی نجم دولتکم فیها واعتدها قسمی من الدول

''میں کئی سال سے آپ کے ستارۂ سعادت کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھا اور اسے اپنی سعادت کا سبب سمجھتا تھا''

ایک جگہ وہب خاندان کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے

وھب یا واھب الھبات اللواتی قصرت دونھا الھبات الرغاب ۶۷

''اے وہب! دادودہش کرنے والے جس کے عطیات کے سامنے بڑے بڑے عطیات ہیچ ہیں''

عبیداللہ کے بیٹے الحسن کے لیے ابن الرومی نے جو قصیدے لکھے ہیں ان کی تعداد ان قصائد سے کم ہے جو دوسرے بیٹے القاسم کے لیے لکھے۔ عبیداللہ کا چھوٹا بیٹا القاسم ابن الرومی کا خاص مربّی تھا۔ چودہ سال کی عمر میں ہی القاسم کو اہم فرائض سونپے جانے لگے تھے۔ ابن الرومی کہتا ہے

فتیً لم یزل مذعدعشراو اربعا لکل جلیل مرتضیٰ اومربضا ۶۸

''وہ ایک ایسا نوجوان ہے کہ چودہ سال کی عمر میں وہ بڑے کام کا اہل ثابت ہوا''

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ۲۷۸ھ میں وھب خاندان کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی القاسم نے ابن الرومی کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا مگر جب وہ برسرِ اقتدار آیا تو اسے بھلا دیا۔

بنی وھب کی بحالی کے بعد بھی القاسم نے ابن الرومی کا وہ وظیفہ جو اس نے پہلے خود مقرر کیا تھا دوبارہ جاری کرنے سے گریز کیا اور یہ امر بھی ثابت ہے کہ ۲۷۸ھ کے موسمِ خزاں میں جب کہ بنی وھب دوبارہ برسرِ اقتدار آئے ہی تھے تو القاسم ابن الرومی کے ساتھ بہت بدسلوکی سے پیش آیا تھا۔ (۶۹) وہ القاسم سے کہتا ہے

أأحییتنی بالأمس ثم تمیتنی برفضی و اقصائی و حقی أن أدنی

''کل تک مجھے زندگی بخشنے کے بعد کیا آج تم مجھ سے نفرت کر کے اور اپنے سے دور رکھ کے موت کے گھاٹ اتاردو گے اس حالت میں کہ میں فی الحقیقت قریب لائے جانے کا مستحق ہوں''

أذوالہٖفاستخد مونی لآلتی بقوتی، أولا فارز قونی مع الزمنی ۷۰

''اگر تو مجھے کسی قابل سمجھتا ہے تو مجھے میری روزی مہیا کرنے کے لئے میری قابلیت کے مطابق مجھے کوئی کام دے اور اگر مجھے اس قابل نہیں سمجھتا تو مجھے بحیثیت ایک ناکارہ انسان گزارہ دے جو بوڑھا ہو گیا ہے''

ابن الرومی اگرچہ تیسری صدی ہجری کے نہایت بلند پایہ شعراء میں سے تھا جس کے شعر کی خصوصیتیں تعجب انگیز طور پر زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق ہیں تاہم سوئے اتفاق وہ شہرت نہ پا سکا جس کا وہ حقدار ہے۔ ابن رشیق قیروانی کو جو ابن الرومی کی طرح خود بھی رومی الاصل تھا اس شاعر کے حالات سے بہت دلچسپی تھی۔(۷۱) وہ لکھتا ہے۔

''وأما ابن الرومی فاولی الناس باسم شاعر لکثرة اختراعه و حسن افتنانه'' (۷۲)

اور پھر ایک جگہ اس کے بارے میں یوں کہتا ہے:

''واکثر المولدین اختراعاً و تولیداً فیما یقول الحذاق ابو تمام و ابن الرومی'' (۷۳)

اور پھر ابن الرومی ہی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''منهم من یوثر المعنی علی اللفظ فیطلب صحته ولا یبالی حیث وقع من هجنة اللفظ وقبحه و خشونته کابن الرومی و ابی الطیب(المتنبی) و من

شاکلهم۔۔۔ وأکثر الناس علیٰ تفضیل اللفظ علی المعنی" (۷۴)

سمعانی نے ابن الرومی کی نسبت لکھا ہے:۔

"احد الشعراء المکثرین المجددین فی الغزل و المدائح والهجاءِ والاوصافِ والتشبیهاتِ و کان محسناً روی عنه جماعة کثیرة من أهل الادب (۷۵)

اسی طرح ابن خلکان بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

" صاحب النظم العجیب والتولید الغریب، یغوص علی المعانی النادرة فیستخرجها من مکانها و یبرز ها فی أحسنِ صورةٍ ولا یترك المعنی حتیٰ یستوفیه الیٰ آخره ولا یبقیٰ فیه بقیة، وله القصاید المطولة المقاطیع البدیعة وله فی الهجاءِ کلّ شئٍ طریق وکذالك فی المدیح" ۷۶

ابن الرومی کے کلام میں شاعری کی ہر وہ صنف موجود ہے جو اس کے زمانہ کے عرب شعراء کے علم میں تھی۔ قصیدہ چونکہ اس کا خاص ذریعہ آمدنی تھا اس لئے اس کے کلام میں قصائد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ قصائد اس کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ۷۷ بعض اوقات اس کی باقاعدہ مرتب مدائح انتہائی طویل ہوتی ہیں۔ اس کے طویل ترین مدحیہ قصیدے میں قریباً تین سو اشعار ہیں۔ ایسے قصیدوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

ابن الرومی کی مدح عموماً خوشامد پر مشتمل ہوتی تھی جس میں مبالغہ آمیز تعریف ہوتی تھی، اور وہ اپنے مربیوں کے ساتھ ایسے اوصاف منسوب کر دیتا تھا جن کے وہ فی الحقیقت حامل نہ ہوتے تھے تاہم بعض حالات میں اگر وہ کچھ خاص خوبیوں کے مالک ہوتے یا انہوں نے واقعی کسی قسم کے کارنامے انجام دیئے ہوتے تو وہ ان کا خاص طور پر واضح الفاظ میں ذکر کرتا

ہے وہ اپنے عدم خلوص کی پردہ پوشی کا قائل نہیں اس ضمن میں کہتا ہے۔

يقولون ما لا تفعلون مسبّة من الله مسبوب بها الشعراء

وما ذاك فيهم وحده بل زيادة يقولون ما لا يفعل الامراء

''اللہ تعالیٰ نے شعراء سے اس بات پر اظہارِ ناراضگی کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں لیکن اس معاملے میں صرف شعراء ہی خطا وار نہیں بلکہ وہ تو وہی کہتے ہیں جو شاہوں کو کرنا چاہیے مگر کرتے نہیں''

ایک اور موقع پر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ:

لو لا عبيد الله قدت ولم أخف رهق الجناح

يا مادح القوم اللئام و طالباً نيل السّحاح

''میں تو اپنے مربی اور مہربان دوست عبیداللہ کی وجہ سے خاموش ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم گھٹیا قسم کے لوگوں کی مدح کرتے ہیں اور بخیلوں سے انعام کی توقع رکھتے ہیں''

ابن الرومی کے قصائد کا اختتام اکثر استدعا پر ہوتا ہے جس میں زیادہ تر ممدوح کی عدم توجہی کے متعلق شکایات بھی شامل ہوتی ہیں۔

ہجو ابن الرومی کی قلم رومانی جاتی ہے اور یہی وہ میدان ہے جس کا وہ شاہسوار ہے اس کے بے شمار ہجویہ قصیدے ہیں جو سینکڑوں اشعار پہ مشتمل ہیں اس کے ہجویہ اشعار کی کل تعداد اتنی ہے کہ مدحیہ اشعار کے بعد ان کا ہی نمبر آتا ہے ابن الرومی کی ہجو دو قسم کی ہے ایک وہ جس میں اس کے حملے درمیانہ درجہ کے ہوتے ہیں اور دوسری وہ جہاں وہ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ ۷۸ مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ'' ابو فراس اتنا کنجوس ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مہمانوں سے فاقے کراتا ہے بلکہ اپنے بخل کی وجہ سے ان کو ان کا اجر بھی دلانا نہیں چاہتا۔(۷۹)

بخیل یصوم اضیافه فیبخل عنهم أجر الصیام

''وہ بخیل ہے اپنے مہمانوں کو روزے رکھاتا ہے اور روزوں کا اجر بھی نہیں دلانا چاہتا''

ابن الرومی کا عام طریق کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ اپنے ممدوح کو اپنا قصیدہ پڑھ کر سناتا اور بعد میں اسے اس قصیدے کی ایک نقل دے دیتا ہے پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کبھی کبھی وہ نفع کی امید پر بلا اجازت بھی لوگوں کو اپنے قصائد کی نقول بھیج دیتا تھا بعض ایسے بھی ہوتے تھے جونقول قبول کرنے سے انکار کردیتے تھے کیونکہ وہ اسے کوئی انعام نہ دینا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک قصیدہ ابراہیم ابن المدبر کے بارے میں ہے جس میں ابن الرومی یوں کہتا ہے:

اردد علی قراطیسی ممزقة کیما تکون رؤوساً للدساتیج [۸۰]

''میرے پھٹے ہوئے اوراق واپس کردو تا کہ وہ ردی کے کام ہی آ جائیں''

ابن الرومی کی زبان شستہ ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ، اس کا اندازِ بیاں بھی عام طور پر مشکل نہیں ہوتا اس کی عربی بھی زیادہ تر ایسی ہی ہے جس قسم کی آج کل کے عربی ادب میں مستعمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کا ایک کثیر حصہ اب بھی بلا تردد تعلیم یافتہ عربی بولنے والوں کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے طور پر اس کی نظموں کے وہ طویل اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں جن کی اشاعت کامل گیلانی اور عقاد نے کی اور جنہیں بہت کم ضرورت پیش آئی کہ پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے اپنی طرف سے بطورِ تشریح کچھ اضافے کر دیں اس کے ساتھ ہی ابن الرومی کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کا سمجھنا خود اس کے دورِ حیات میں بھی مشکل تھا۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ اس نے اپنی بعض نظموں کے لئے

مفید تشریحات بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ تشریحات عبیداللہ بن عبداللہ، علی بن یحییٰ اور ابن بلبل جیسے ماہر استادوں کو بھیجی گئی تھیں۔ اس نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ فی الواقع اس کی یہ تشریحات مذکورہ ماہرین کے لئے نہ تھی بلکہ یہ ان لوگوں کے استفادہ کے لئے تھیں جو نا مانوس الفاظ کے معانی سے لاعلم تھے۔ اگر چہ ابن الرومی عادتاً غیر معروف اور نئے الفاظ کا استعمال نہیں کرتا مگر پھر بھی اس کے کلام میں ایک کثیر تعداد ایسے الفاظ کی موجود ہے جو لغت میں نہیں ملتے یہ الفاظ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے چند فارسی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو شاید دمِ تحریر بغداد کی عربی کا حصہ بن چکے تھے۔(۸۱)

ایک بڑا شاعر زندگی کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریۂ فکر رکھتا ہے وہ جس طور پر زندگی کو دیکھتا ہے اسی نہج کو اپنا لیتا ہے اور اس مخصوص اندازِ خیال کی بدولت اس کو متعدد دوسرے شعراء پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک بلند پایہ شاعر کا کلام ہر شے پر محیط ہوتا ہے دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس کے اشعار میں منضبط ہو جاتی ہے اس کے دل کی آواز، ضمیر کی پکار ماحول کا اثر سب ہی کچھ اشعار میں ڈھل جاتا ہے کیونکہ وہ بجائے ہموار راہوں پر سفر کرنے کے نئے راستے استوار کرتا ہے اس طرح سے وہ اپنے کلام میں جدت پیدا کر دیتا ہے اس کا شعور عام سطح سے بلند ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے شعر کو بآسانی ہر ڈگر پر ڈال سکتا ہے اگر کوئی اس کلام سے مستفید ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں ایک دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔ کہ اس سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی۔ ایک بہترین شاعر عام شاعر کی طرح دنیا کی وسعت کے سبب شعر گوئی سے عاجز نہیں آ جاتا بلکہ وہ اپنے فن میں نئی راہیں کھولتا اور فہم وادراک کو کام میں لا کر نئے نئے آثار چھوڑتا ہے۔ (۸۲)

بڑے بڑے شعراء بعض اوقات دنیا کو مرقع حسن و جمال بنا کر پیش کرتے ہیں تو ایک

سیر گاہ، عبادت خانہ یا جنگ و جدل کا میدان یا راہ گزر یا فرحت و انبساط کا سر چشمہ دکھاتے ہیں یا پھر دنیا کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔لیکن اگر آپ کسی شاعر کا کلام پڑھیں اور پھر آپ کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہو کہ دنیا کیا ہے اور آپ کے پاس اس کا جواب نہ ہو تو وہ شاعر خواہ کتنا ہی اچھا ہو مگر بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔(۸۳)

ایک بڑے شاعر کے لئے ساری دنیا کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ واقفیت عام واقفیت سے کم و بیش مختلف ہو اور اسی چیز کو فلسفۂ شاعر کا نام دیتے ہیں اس ضمن میں ہم مفکرین کی بیان کردہ تشریح سے انحراف نہیں کر سکتے۔

اس موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ابن الرومی کی ذات کو اگر چہ فلسفہ سے گہرا تعلق نہ تھا لیکن ابن الرومی متضاد طبیعت کا مالک تھا جس کی کہ ایک فلسفی کو ضرورت ہوتی ہے کیونکہ فلسفی پہلے ہر چیز کی تجدید کرتا ہے تا کہ اپنی فکری آنکھ سے فوارق و جزئیات سے بلند ہو کر غور کر سکے مگر ابن الرومی پہلے ہر شئے کو ایک جسم عطا کرتا ہے اور پھر اس کو مختلف شاخوں انوار و اشکال اور خطوط و حرکات میں منقسم کر کے دیکھتا ہے۔(۸۴)

بسا اوقات پڑھنے والا ابن الرومی کے وسوسوں، اوھام اور اسرار وغیرہ سے گھبرا کر اس کو اہل باطن میں سے خیال کرنے لگتا ہے جو دنیا کو روحانی نظر سے دیکھتے ہیں اس کی یہ خوبی اس کو ماہر فلسفیوں کے نزدیک لے آتی ہے۔ ماہر فلسفی اہل باطن کی طرح اس دنیا کو نہایت گہرائی سے دیکھتے ہیں اور وہ باطن کو ظاہر پر ترجیح دیتے ہیں ان کے نزدیک ظاہر محض ایک وہم اور جھوٹ ہے کہ جس کا کوئی وجود نہیں سوائے گمراہ کن فریب کے، اس کے برعکس ابن الرومی ایک چیز کا ہلکا سا خاکہ پیش کر کے اس کے اسرار و رموز کا ظاہری لباس پہنائے گا اور اس طرح وہ ایک پوشیدہ عالم کو عالم مجسم و محسوس کی طرح بیان کرے گا۔ اہل باطن ظواہر کی

نفی کر کے اسرار کو ثابت کرتے ہیں اور ابن الرومی اسرار و رموز کی نفی کے بعد ظاہر کو ثابت کرتا ہے۔

ابن الرومی کا احساس اس کے بڑھاپے اور جوانی میں یکساں طور پر جدید رہا ہے اس کی پوری زندگی ہمیشہ بچوں کی سی گزری ہے وہ سدا اپنے دوستوں کو ایک نئی خوشی اور ایک نئے خوف کی نظر سے دیکھتا رہا ہے اس کی طفولیت ابدی تھی لیکن بیماریوں اور غم و الم کی وجہ سے کچھ ڈری ڈری سی ہے کہ اس دنیا میں ہر بھڑکانے والے حادثے کی طرف تیز احساس کے ساتھ دیکھتی ہے۔ اس کی طفولیت سالوں کے گزرنے پر بھی بڑھتی ہی چلی گئی اور لہو و لعب ہی میں منہمک رہی مٹھائی کے شوق اور مار کے خوف کے نیچے دبی رہی۔ اس کی پوری شاعری میں صرف ایک بات پائیں گے جو ایک بڑے بچے کی گفتگو کے مشابہ ہے جو گو بڑوں سے زیادہ معاملات کو سمجھتا ہے مگر وہ محسوس بچوں کی طرح ہی کرتا ہے۔ (۸۵)

وہ نہ صرف صبر و جدائی کا ذکر کرتا ہے بلکہ اس کے کلام میں زہد و تقویٰ عفت و پاکبازی کا بھی ذکر ہوتا ہے دانائی و نصیحت کی باتیں اور نیت و عقیدہ کی باتیں بھی کرتا ہے غرض یہ ہر صنفِ سخن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس کے کلام میں خباثت و ریا نہیں ہوتی۔ وہ خوشی و مسرت کی کیفیتوں کے بیان کرنے میں بہار و خزاں کے ذکر میں عجلت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کلام میں پند و نصائح جمع ہو کر رہ جاتی ہیں کسی نئی خوشی پر بڑے معصوم بچے کی طرح اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور کبھی وہ نئے الم کو پا کر چیخ اٹھتا ہے اس کے کلام پر فلسفیانہ انداز سابقہ طرزِ فکر اور قدیم احساس کی بدولت عاری نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے اپنے ذہن کی اپج ہے۔

اس فلسفے کو ''اپیکورین'' Epecurian فلسفہ کا نام دیا جاتا ہے یعنی لذت و فرحت کی

جستجو کرنا اور رنج و الم سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرنا اگر اس بچے کو جو مٹھائیوں کا شائق اور مار سے خائف ہو اپیکورین خیال کیا جاتا ہے تو ابن الرومی بھی اپیکورین گروہ سے جدا نہیں ہے۔ لیکن اپیکورین فلسفہ مسرتوں اور غموں میں جدتِ احساس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تو بگڑے ہوئے احساس اور بڑھاپے کی بدولت ہے کہ کبھی تو یہ دونوں چیزیں انسان کو طمانیت بخشتی ہیں تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ ان سے عاجز آجاتا ہے اور فرار کی خواہش کرتا ہے تو مشتعل ہو جاتا ہے اور انہی کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہے۔ ابونواس کی شاعری بھی اسی کی مظہر ہے کبھی رنج و الم کا تکلیف دہ روپ دھارتی ہے تو کبھی مسرت و انبساط کی سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے یہی اصل اپیکورین فلسفہ ہے اور وہ اپیکورین ہی تھا جو لذتوں کا طلب گار اور الم سے کنارہ کش ہوتا ہے۔(۸۶)

لیکن ابن الرومی اس لئے کبھی غمزدہ ہوتا تھا اور کبھی مسرور کہ اس کی زندگی خوشی و غم کا مجموعہ تھی یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کو محسوس بھی کرتا ہو اور نہ ایسے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں کچھ غم اور کچھ خوشی ہو نہ ہم اس کو احساس سے بالکل خارج کر سکتے ہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے لذتوں کو اختیار کرتا تھا اور اپنی خواہش سے غموں سے بچتا تھا کیونکہ بہتی ہوئی نہر نہ تو صفائی کر سکتی ہے اور نہ گدلے پن سے بچ سکتی ہے کبھی وہ صاف ہوتی ہے کبھی مکدر کیونکہ وہ بہتے ہوئے پانی کی مانند تھا یعنی اس کی شاعری ایک بہتا ہوا دریا ہے جو کبھی مصفا ہے تو کبھی مکدر۔

ابن الرومی پر نہ بڑھاپے کا عالم طاری ہوا اور نہ اپیکورین فلسفہ کا اثر چڑھا بلکہ یہ تو ابدی طفولیت تھی جو اس کے احساس پر چھائی ہوئی تھی۔

یہ ابدی طفولیت غم و خوشی کے بارے میں جدید احساس کی مالک ہے اور یہ احساس

فقدانِ شباب کے بعد اور بھی دوام پا گیا ہے اسے زندگی پر خوشیوں کا شدید لالچ رہا یعنی وہ مسرتوں کے پیچھے بھاگتا رہا اور مسرتیں اس سے دور بھاگتی رہیں اس کے نزدیک زندگی کی اصلی خوشی عالم شباب تھا اور وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ جوانی اور جوانی کی امنگیں از سرِ نو لوٹ نہ آئیں۔ وہ کہتا ہے۔

لو یدوم الشباب مدة عمری لم تدم لی بشاشة الأوطار

کل شئ له ثناه وحد کل شئ یجری الیٰ المقدار ۸۷

''اگر جوانی مدت العمر باقی رہتی تو بشاشت باقی نہ رہتی،

ہر چیز کی ایک انتہا اور حد ہوتی ہے چیز کی تکمیل ایک مقدار پر ہو جاتی ہیاسی لئے وہ زندگی بھر قانع نہ ہوسکا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگا رہا۔

☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

(۱) The Arabic Literature. Huart. P.82

(۱) مسعودی مروج الذہب، ۸/۲۳۰

یاقوت حموی، معجم الادباء، ۱۸/۱۱۴، مطبعہ سلفیہ مصر

(۳) ابن خلدون، ۲:۴۹۹، دار المعارف مصر

(۴) محمد عبد الغنی حسن، ابن الرومی، ص۲۰، دار المعارف مصر، ۱۹۵۵ء

(۵) کامل گیلانی، دیوان، ص:۲۸۵، مطبعہ التوفیق الادبیہ ۱۹۲۴ء

(۶) عمر فروخ ابن الرومی، ص:۹، مکتبہ منیمنہ بیروت ۱۹۴۹ء

(۷) عباس محمود عقاد، ابن الرومی، ص:۸۰، شرکۃ مساھمہ مصریہ مصر ۱۹۳۸ء

(۸) احمد الاسکندری، الوسیط، ص۔۲۶۸، مصر ۱۴۵۱ء

(۹) کامل گیلانی، دیوان، ص:۷۵

(۱۰) عباس محمود العقاد ابن الرومی، ص۔۱۵۷

(۱۱) شوقی ضیف، الفن واتجاھہ فی شعر الحدیث، ص:۲۲۰، دار المعارف، مصر ۱۹۴۰ء

(۱۲) احمد الامینی ''الغدیر'' ۳/۳۰، طبعۃ نجف تہران، ۱۹۳۶ء

(۱۳) انیس مقدسی، ''امراء الشعر العربی فی العصر العباسی'' ص:۲۷۳، دار العلم بیروت، ۱۹۲۶ء

(۱۴) ''رسالۃ الغفران'' ۲/۸۱، المصری، دار المعارف مصر

(۱۵) Life and Works of Ibn-er-Rumi, P.48

(۱۶) کامل گیلانی ،الدیوان،ص:۹۲

(۱۷) عقاد،ابن الرومی،ص:۲۱۱

(۱۸) عباس محمود عقادد، ابن الرومی،ص:۱۰

(۱۹) ابن طباطبا، الفخری فی الادب السلطانیہ،ص:۲۳۰، دارالمعارف،مصر۱۹۲۴ء

(۱۲) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد،۲/۳۴۳،بدار محافظ مصر، ۱۹۳۱ء

(۲۲) جلال الدین سیوطی ،تاریخ الخلفاء،ص:۳۴۲،نفیس اکیڈمی کراچی،۱۹۸۳ء

(۲۳) ابن جریر، تاریخ ظہری،۱۰/۳۰۴ ، مطبعہ بریل لیڈن، ۱۸۸۵ء

(۲۴) ابن اثیر، الکامل، ۶/۱۳۶ ، ادارہ طباعۃ المنیر یہ مصر

(۲۵) مسعودی، مروج الذہب،۷/۱۳۹

(۲۶) عبدالغنی حسن، ابن الرومی،ص۶ ، دارالمعارف مصر، ۱۹۵۵ء

(۲۷) سیوطی، تاریخ الخلفاء،ص:۱۴۲

(۲۸) سیوطی، تاریخ الخلفاء،ص:۳۴۶، لاہور،۱۹۷۰ء

(۲۹) عبدالغنی حسن، ابن الرومی،ص:۶ (بحوالہ تاریخ طبری)

(۳۹) احمد امین، ظہر الاسلام، ۱/۱۰ ،قاہرہ، ۱۹۴۶ء

(۳۱) ابن طباطبا، الفخری فی الاداب السلطانیہ،ص:۲۱۶

(۳۲) مسعودی، مروج الذہب ، ۷/۳۰۳، مطبعہ سعادۃ مصر، ۱۹۴۸ء

(۳۳) ابن جریر، تاریخ طبری،۱۲/ ۱۴۸۸، مطبعہ سلفیہ مصر

(۳۴) مسعودی، مروج الذہب ۷/۳۹۹

(۳۵) ابن اثیر، الکامل، ۲۰/۱۳۱

(۳۶) ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، ۳/۳۳۹

(۳۷) معین الدین، تاریخ اسلام، ص:۳۴۱، ناشران قران لمیٹڈ اردو بازار لاہور

(۳۸) جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص:۲۴۷

(۳۹) حمزہ اصفہانی، تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء، ص:۶۷، دارمکتبہ الحیاۃ بیروت

(۴۰) خطیب بغدادی تاریخ بغداد، ص:۴۹۳۲، بدار محافظ، مصر ۱۹۳۱ء

(۴۱) A literary History of the Arabs. Nicholson.P.265

(۴۲) کامل، 'الدیوان' ص:۲۳۶

(۴۳) Life and works of Ibn-er-Rumi,P.78. British, London, 1944.

(۴۴) ابن الجوزی، المنتظم، ۵/۱۶۷، دائرہ معارف حیدر آباد دکن

(۴۵) عقاد، ابن الرومی، :۱۵۷

(۴۶) کامل، 'الدیوان' ص:۳۴۱

(۴۷) تاریخ طبری، ۳/۱۵۴۴

(۴۸) Life and works of Ibn-er-Rumi,P.80

(۴۹) ابن اثیر، الکامل، ۲/۱۳۱

(۵۰) ۔ایضاً۔

(۵۱) مرزبانی، معجم الشعراء، ص:۴۵، مطبعہ سلفیہ مصر

(۵۲) تاریخ طبری، ۳/۳۱۷۸، مطبعہ سلفیہ مصر

(۵۳) ابن ندیم الفہرست:۱۷۶، مطبعہ رحمانیہ مصر

(۵۴) کامل گیلانی، دیوان،ص: ۱۲۱

(۵۵) کامل گیلانی، دیوان،ص:۱۸۱

(۵۶) یاقوت حموی،معجم الادباء، ۵/۳۳۵، مطبعہ سلفیہ مصر

(۵۷) کامل،الدیوان ،ص:۲۸۰

(۵۸) تاریخ طبری،۳/۲۱۱۴

(۵۹) الھلال،ص:۱۱

(۶۰) تاریخ طبری،۳/۲۱۲۷

(۶۱) خطیب بغدادی،تاریخ بغداد،۱۲/۲۵

(۶۲) کامل،'الدیوان' ص: ۳۷۵، احمد امین،ظہر الاسلام،۱/۶۷

(۶۳) ابن خلکان،دفیات الاعیان، ۱/۲۰۶، دار صادر، بیروت،۱۹۷۲ء

(۶۴) یاقوت،معجم الادباء ، ۱/۱۳۶

(۶۵) یاقوت،معجم الادباء،۲/۴۱۷

(۶۶) ابن خلکان، وفیات الاعیان،۱/۲۵۲

(۶۷) عباس محمود عقاد، ابن الرومی،ص:۱۵۶

(۶۸) Life and Works of Ibn-ur-Rumi.P.104

(۶۹) الحصری،زہر الآداب، ۲/۱۷۱،طبع عیسی حلبی،۱۹۵۳ء

(۷۰) محمد عبدالغنی حسن، ابن الرومی،ص:۶۷

(۷۱) ابن رشیق، کتاب العمدہ،۲/۱۹

(۷۲) ابن رشیق، کتاب العمدہ، ۱۹۴/۲، قاہرہ ۱۹۳۴ء

(۷۳) ابن رشیق، کتاب العمدہ، ۱۷۷/۱

(۷۴) ابن رشیق، کتاب العمدہ، ۸۲/۱

(۷۵) السمعانی، کتاب الانساب، ص:۲۶۳۸، گب میموریل، ۱۹۱۲ء

(۷۶) دفیات الاعیان، ۲۵۱/۱

(۷۷) مرزبانی، معجم الشعراء، ص:۲۸۹

(۷۸) عبدالغنی حسن، ابن الرومی، ص:۵۰

(۷۹) عمر فروخ، ابن الرومی، ص:۳۵

(۸۰) Life and work of Ibn-er-Rumi,P.126

(۸۱) اجی عثمان عمرو بن الجاحظ، البیان والتبین، ۱۳۱/۱، مطبعہ رحمانیہ مصر، ۱۹۲۸ء

(۸۲) عقاد، ابن الرومی، ص:۳۰۳

(۸۳) عقاد، ابن الرومی، ص:۳۰۴

(۸۴) مناھل الادب العربی مختارات ابن الرومی، مکتبہ صادر بیروت ۱۹۵۲ء

(۸۵) عقاد، ابن الرومی، ص: ۳۰۵

(۸۶) عمر فروخ، تاریخ الفکر العربی، ص:۱۷۸، منشورات المکتب التجاری بیروت ۱۹۵۹ء

(۸۷) کامل، ''الدیوان'' ص: ۳۸۵

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 67 - 80

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

اہم علمی و ادبی فارسی ویب سائٹس

ڈاکٹر سیّد محمد فرید☆

Abstract:

Time is like an ever flowing water and takes away everything coming to its way. Man has made some unbelievable progress during the past two decades. Computer brought revolutionary changes and the internet made the process complete in all respects. Now the magic mirror is no more a fantasy or mythology but a hard fact and a proven reality. Literally the world is at the finger tips and the knowledge is at the distance of your desire. In this article, some important educational and literary Persian websites have been itroduced for the benefit of both students and scholars.

Key words: Modern research methodology, Internet, Persian websites.

گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز انقلابات رونما ہو چکے ہیں۔ ذرائعِ مواصلات ناقابلِ یقین حد تک ترقی کر گئے ہیں اور ان کی بدولت کرۂ ارض سمٹ کر Global Village کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

انٹرنیٹ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ذریعۂ اطلاعات و مواصلات ہے جس کے بے شمار فوائد ہیں۔ انٹرنیٹ کا ایک شعبہ ویب سائٹس ہیں جو کسی بھی موضوع کے بارے میں علم و آگاہی کے حصول کا جدید ترین اور آسان ترین ذریعہ ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ، دنیا بھر میں تقریباً ۴۸۰ ملین لوگ ویب کے صفحات سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ استفادہ تعلیمی و تحقیقی بھی ہے اور تفریحی بھی ، اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ طلبہ اور محققین کی بڑی تعداد ویب سائٹس کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ علمی و تحقیقی مقالات میں منابع کے طور پر ویب سائٹس سے استفادے کی روایت کا پوری دنیا میں آغاز ہو چکا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں چونکہ امکانات زیادہ ہیں، اس لیے وہاں استعمال کی شرح بھی زیادہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے نامور محققین ،صحافی اور دانشور اپنی تحریروں میں اہم ویب سائٹس کے حوالے دیتے ہیں اور اب تو ترقی پذیر ممالک کے بیشتر اہلِ قلم کے ہاں بھی یہی صورتِ حال دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ اہم اور مستند ہونے کے حوالے سے جس طرح کتابوں کی درجہ بندی ہوتی ہے ، اِسی طرح ویب سائٹس میں بھی معیاری اور غیر معیاری کا فرق موجود ہے۔ تحقیقی میدان میں جس طرح ہر کتاب حوالہ جاتی اہمیت کی حامل نہیں ہوتی ، اِسی طرح ہر ویب سائٹ بھی اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے بطور حوالہ استعمال کیا جائے۔ طلبہ اور محققین اپنے موضوع سے متعلق ویب سائٹس کا جائزہ لے کر ان کا مقام اور معیار مُتعیّن کر سکتے ہیں۔

فارسی زبان و ادب اور ایران شناسی کے بہت سے شعبوں سے متعلق کئی مفید ویب سائٹس بھی موجود ہیں جو زیادہ تر ایرانی ہیں۔ ہمارے طلبہ اور اہل تحقیق ان سے زیادہ آگاہ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی کی علمی، ادبی اور ثقافتی ویب سائٹس کے بارے میں اُردو

میں موجود مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ مقالہ جو اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اِس موضوع پر اُردو میں پہلا با قاعدہ مضمون ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ فارسی علم و ادب کی چند بہتر، مستند اور مفید ویب سائٹس کا تعارف کرایا جائے تا کہ عام شائقین، طلبہ، اساتذہ اور محققین ان سے علمی استفادہ کر سکیں۔

فارسی کی وہ ویب سائٹس جو علمی، ادبی اور ثقافتی مطالعات کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں، عام طور پر تین طرح کی ہیں:

۱۔ مختلف علمی، تدریسی، تحقیقی، ثقافتی اور اشاعتی اداروں کی ویب سائٹس۔

۲۔ مختلف علمی، ادبی، تحقیقی اور ثقافتی موضوعات کی ویب سائٹس۔

۳۔ مشاہیرِ علم و ادب و ثقافت کی ویب سائٹس۔

مختلف علمی، تدریسی، تحقیقی، ثقافتی اور اشاعتی اداروں کی ویب سائٹس کے حوالے سے یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ایران کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں، علمی و تحقیقی مراکز، عجائب گھروں، ثقافتی اداروں اور پبلشروں کی اپنی ویب سائٹس موجود ہیں۔ اس سلسلے میں خانۂ فرہنگِ ایران لاہور نے ۲۰۰۵ء میں تیرہ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے: ''اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی، تعلیمی اور ادبی مراکز کی ویب سائٹس''۔ اس کتابچے میں پندرہ ثقافتی مراکز (ص: ۲۔۳)، گیارہ اخبارات (ص: ۴)، فنون لطیفہ کے چھ مراکز (ص:۵) اڑتیس یونیورسٹیوں اور کالجوں (ص: ۶ ۔ ۹)، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور فلم سے متعلق دس اداروں (ص:۱۰)، ہنر و ادبیات کے نو مراکز (ص: ۱۱)، تین لائبریریوں (ص: ۱۲) اور نو رسائل و جرائد (ص: ۱۳) کی ویب سائٹس کے ایڈریسز دیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر یہ پہلی کاوش ہے اور قابلِ تحسین ہے، لیکن اس سے تشنگی کا احساس برقرار رہتا ہے کیوں کہ اس میں

صرف ایڈریسز دیے گئے ہیں اور مختصر سا تعارف بھی موجود نہیں ہے(اسے ضمیمے کے طور پر مقالے کے آخر میں شامل کیا جارہا ہے)۔ ان میں فارسی علم و ادب کے حوالے سے مفید اور حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ویب سائٹس یہ ہیں :

۱۔ ایرانی ثقافتی ورثے کی ایک رنگا رنگ ویب سائٹ معلوماتی ، سیاحتی ، ثقافتی اور ایران شناسی کے دیگر پہلوؤں کے حوالے سے اہم ہے۔ اس میں ضمناً فارسی شعر و ادب کی معلومات بھی ملتی ہیں : www.iranmiras.ir

۲۔ سیاحتی نقطۂ نظر سے ایک ویب سائٹ : www.itto.org بہت مفید ہے۔ اس میں ایران کے اہم شہروں، شاہراہوں ، قابلِ دید مقامات، فنون لطیفہ، دستکاریوں ، آب و ہوا اور ذرائع آمد و رفت وغیرہ کے بارے میں اچھی معلومات ہیں۔

۳۔ ایرانی وزارتِ ثقافت کے ذیلی ادارے سازمان فرہنگ و ارتباطاتِ اسلامی کی ویب سائٹ :www.icro.ir اس اعتبار سے بہت اہم اور مفید ہے کہ اس میں فارسی علم و ادب اور ثقافت کے بارے میں دنیا بھر کی تازہ ترین خبریں ملتی ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ایران کے ثقافتی مراکز کا تعارف اور ان کی علمی ، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل اس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے نیز ایرانیات سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں اور ایرانی ادب کے تراجم سے بھی آگاہی ملتی ہے۔علم وادب کے بارے میں بہت سے اہم مضامین بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔

۴۔ فارسی زبان و ادب کے حوالے سے دو فعّال ایرانی ادارے بہت اہم ہیں۔ ان کی ویب سائٹس فارسی زبان و ادب کے طلبہ ، اساتذہ اور محققین کے لیے بہت مفید ہوسکتی ہیں :

فرہنگستانِ زبان و ادبِ فارسی : www.persianacademy.ir

شورایِ گسترشِ زبان و ادب فارسی : www.persian_language.org

۵۔ ایرانی لائبریریاں دنیا کی ثروت مند ترین لائبریریوں میں شمار ہوتی ہیں۔ تمام ایرانی یونیورسٹیوں کی لائبریریوں تک رسائی متعلقہ یونیورسٹی کی ویب سائٹ سے ہوسکتی ہے۔ ان کے علاوہ دو اہم لائبریریوں کی ویب سائٹس یہ ہیں:

آستانِ قدس رضوی لائبریری، مشہد : www.aqlibrary.org

ایران نیشنل لائبریری۔ تہران : www.nli.ir

یہ دونوں لائبریریاں محض کتب خانے نہیں بلکہ بہت بڑے ادارے ہیں اور ان کے تحت کئی مفید ذیلی شعبے کام کرتے ہیں۔ ان کی تمام سرگرمیوں کی اطلاعات ان ویب سائٹس سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

اب کچھ مزید ویب سائٹس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ تمام سائٹس خانۂ فرہنگ ایران، لاہور کے شائع کردہ مذکورہ کتابچے میں شامل نہیں ہیں:

۱۔ ایران کی قدیم زبانوں، علاقائی بولیوں کے تعارف اور ان کی نثری و شعری تخلیقات کے نمونے پر مشتمل یہ سائٹ بہت معلوماتی، مفید اور دلچسپ ہے

www.iranianlanguages.com:

۲۔ www.iranculturestudies.com کے تحت حسن کا مشاد کی مشہور کتاب Modern Persian Prose (1968) کے اہم حصّوں کے علاوہ قدیم و جدید فارسی نظم و نثر کے بارے میں بہت سا مفید مواد دستیاب ہے۔

۳۔ www.art-arena.com پر محمود کیانوش کی اہم کتاب Modern Persian Poetry (1996) کے اہم اقتباسات کے علاوہ نیما یوشیج، فریدون توللّی، نصرت رحمانی، مہدی اخوان ثالث، اسماعیل خویی، نادر نادر پور، شفیعی کدکنی، احمد رضا احمدی، سہراب سپہری اور محمود کیانوش وغیرہ جیسے جدید ایرانی

شاعروں کا تعارف اور نمونہ کالم موجود ہے۔ یہ سائٹ حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہے۔

۴۔ www.iranchamber.com کے تحت ایران کی قدیم زبانوں ، رسم الخط، قدیم و جدید نظم ونثر، اہم شاعروں اور ادیبوں اور فکشن کے بارے میں کئی اہم مضامین سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور ان کی تخلیقات کے تراجم بھی موجود ہیں۔

۵۔ ایران آن لائن کی ویب سائٹ :www.iranonline.com ایک آن لائن انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فارسی زبان و ادب کے مطالعات کے لیے اہم حوالہ بن سکتی ہے۔ اس میں بہت سے قدیم و جدید فارسی ادیبوں اور شاعروں کا تعارف ، ان کی تخلیقات کے متن اور تراجم اور ان کے فکر وفن کے بارے میں مفید مضامین موجود ہیں۔ طبری ادبی کے تحت گیلکی اور مازندرانی بولیوں کا ادب بھی موجود ہے۔ بچوں کی کہانیاں بھی ملتی ہے جو ابتدائی سطح کے طالب علموں کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔

۶۔ www.parstimes.com نامی سائٹ بھی بہت اہم ہے۔ اس میں ایران کے اہم علمی و ادبی رسالوں کا تعارف، ان کے مضامین کا خلاصہ، ادبی وتحقیقی اداروں اور نمایاں شاعروں ، ادیبوں کا تعارف ، ان کا نمونہ تخلیقات ، معاصر ایرانی ادب ، ایران سے ہجرت کر جانے والے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات، فارسی افسانوں اور ناولوں کے تنقیدی مطالعات اور ضرب الامثال وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے کئی اور سائٹس بھی منسلک ہیں۔

۷۔ فارسی کے دو اہم آن لائن علمی و ادبی رسالوں تک رسائی ان ایڈریسز کے ذریعے ہوسکتی ہے:

کیلے فورنیا سے شائع ہونے والا سہ ماہی مجلّہ رہ آورد

www.rahavard.com:

رسالہ ادبیات: www.edebiyat-journal

۸۔ نسخہ شناسی اور کتاب شناسی ، فارسی علم و ادب کا بہت بڑا تحقیقی موضوع ہیں ۔قلمی نسخوں اور ان کے ذخائر ، فہرستوں ، فہرست نگاری کے اصول وقواعد، فہرست نگاروں کے تعارف اور قلمی نسخوں کی تحقیق و اشاعت کے بارے میں آگاہی کے لیے یہ دو مستند سائٹس متعارف کرائی جاتی ہیں :

بیاض : www.bayaz.net

سواد : www.savad.net

۹۔ فارسی کے کئی اہم پبلشرز کی سائٹس بھی موجود ہیں جن میں وہ اپنی مطبوعات کا تعارف کراتے رہتے ہیں۔ ان سے تازہ ترین کتابوں کے موضوعات اور ان کی اہمیت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ مزدا پبلشرز کی یہ سائٹ: www.mazdapublisher.com اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں فارسی علم و ادب کے ہر شعبے میں شائع ہونے والی کتابوں کے علاوہ ، آئندہ اشاعتوں اور نایاب کتابوں کے تعارف اور ان کی آن لائن خرید وفروخت کا اہتمام کیا گیا ہے۔علم و ادب سے متعلق نئی سے نئی کتابوں سے آگاہ رہنے کے لیے یہ سائٹ بہت مفید ہے۔ اس کی مدد سے تازہ ترین منابع تک رسائی ممکن ہوسکتی ہے۔

۱۰۔ جدید فارسی شعر و ادب کے حوالے سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نثر نگاروں میں سے سیّد محمد علی جمالزادہ ، صادق ہدایت ، ہوشنگ گلشیری ، جلال آل احمد اور صادق چوبک اور شاعروں میں سے نیما یوشیج ، فروغ فرخزاد، سہراب سپہری ، مہدی اخوان ثالث اور احمد شاملو کے بارے میں زیادہ سائٹس موجود ہیں۔ جدید فارسی ادب کی

چند مفید سائٹس یہ ہیں:

1. www.farhangsara.com
2. www.farsinet.com
3. www.iranpoetry.com
4. www.mehrganfoundation.com
5. www.perlit.sailorsite.net/modernlit.html
6. www.shabesher.com

منابع :

1. www.aqlibrary.org
2. www.art-arena.com
3. www.bayaz.net
4. www.edebiyat-journel.com
5. farhangsara.com
6. farsinet.com
7. icro.ir
8. iranchamber.com
9. iranculturestudies.com
10. iranianlanguages.com
11. iranmiras.ir
12. iranonline.com
13. iranpoetrycom
14. itto.org
15. mazdapublisher.com
16. mehrganfoundation.com
17. nli.ir

18. parstimes.com
19. perlit.sailorsite.net
20. persianacademy.ir
21. persian-languages.org
22. rahavard.com
23. saved.net
24. shabesher.com

ضمیمہ

اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی، تعلیمی اور ادبی مراکز کی ویب سائٹس

خانۂ فرہنگِ جمہوری اسلامی ایران، لاہور، ۲۰۰۵ء

ثقافتی مراکز:

1.www.khamenei.ir
2.www.wilayah.ir
3.www.awqaf-i.org
4.www.itf.org.ir
5.www.imam-khomeini.com
6.www.dialoguecentre.org
7.www.iranmiras.ir
8.www.itto.org
9.www.ershad.gov.ir
10.www.mullasadra.org
11.www.nioc.org

12.www.mfa.govir

13.majles.ir

14.www.president.ir

15.www.imamreza.net/arb

16.www.icro.ir

اخبارات :

1. www.iran-daily.com
2. www.iran-varzeshi.com
3. www.ettelaat.com
4. www.hamshahri.org
5. www.iran-newspaper.com
6. www.kayhannews.ir
7. www.iran-emrooz.net
8. www.iran-news.com
9. www.tehrantimes.com
10. www.jomhourieslami.com
11. www.donya-e-eqtesad.com

فنون لطیفہ :

1. www.khoshnevis.com
2. www.art.arena.com
3. persianpaintings.com
4. www.galleryovissi.com
5. www.ressouli.com

یونیورسٹیاں اور کالجز:

1. www.aku.ac.ir
2. www.ajums.ac.ir
3. www.iau-abhar.ac.ir
4. www.basu.ac.ir
5. www.mubabol.ac.ir
6. www.um.ac.ir
7. www.hums.ac.ir
8. www.mui.ac.ir
9. www.iust.ac.ir
10. isu.ac.ir
11. www.iau.ac.ir
12. www.iums.ac.ir
13. www.kntu.ac.ir
14. www.kums.ac.ir
15. www.kmu.ac.ir
16. uok.ac.ir
17. www.pnu.ac.ir
18. www.put.ac.ir
19. www.shirazu.ac.ir
20. www.sbu.ac.ir
21. www.sharif.ac.ir
22. www.semnan.ac.ir

23. www.sadjad.ac.ir
24. www.qom.ac.ir
25. www.tums.ac.ir
26. www.modares.ac.ir
27. www.tabrizu.ac.ir
28. www.ut.ac.ir
29. www.ui.ac.ir
30. www.gu.ac.ir
31. www.usb.ac.ir
32. www.iut.ac.ir
33. www.golestangums.ir
34. www.urmia.ac.ir
35. www.vru.ac.ir
36. www.jazduni.ac.ir
37. www.yu.ac.ir
38. www.znu.ac.ir

ٹیلی ویژن۔ ریڈیو۔ فلم

1. www.irib.ir/tv
2. www.tv2.irib.ir
3. www.tv3.irib.ir
4. www.tv4.irib.ir
5. www.tv5.irib.ir

6. www.jame-jam.ir
7. www.cinemairan.com
8. www.irna.com
9. www.soroush-media.com
10. www.fcf-ir.com

ہنر و ادبیات :

1. www.cgie.ir
2. www.tamasha.com/art/poetry/sepehri.htm
3. www.rumionfire.com
4. www.okonlife.com
5. www.persianacademy.ir
6. www.persian-language.org
7. www.mirasmaktoob.com
8. www.mahfel.com/main.htm
9. www.kar-online.com/honar

لائبریریز:

1. www.aqlibrary.org
2 .www.nli.ir/new/persian/default.asp
3. www.imamalinet.net

رسائل ۔ ماہنامہ:

1. www.mani-poesi.de
2. www.tchissta.com
3. www.kayhanhavai.com
4. www.soroushpress.com
5. www.webeiran.com
6. www.persian-heritage.com
7. www.tavoosmag.com
8. www.shahrvand.com
9. www.rahe-azadi.de

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 81 - 90

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

سبک ہندی کی فارسی غزل، نمایاں خصوصیات

ڈاکٹر محمد صابر ☆

Abstract:

The classical Persian poetry is divided into three major poetic styles named: Khorasani, Iraqi and Hindi. Ghazal got more attention of the poets and literary people during Saljuqi and Mongol periods but became the most desireable poetic version Timurids reign. Sa'di and then Hafiz took the Ghazal to new heights but it was Hindi or Indian style Persian poetry which introduced new trends in Ghazal. In this article Indian style Persian Ghazal has been critically evaluated.

Key words: Persian Ghazal, Indian style, Importance.

تھران یونیورسٹی کے فاضل استاد جناب ڈاکٹر غلام رضا ستودہ نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان ''سبک سخنوری فارسی عصر صفوی راچہ بنامیم'' میں صفوی عہد (۹۰۷-۱۱۳۵ق) کے شعرا کے سبک کو ایرانی اور غیر ایرانی محققین کے حوالے سے چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۱) بعض اسے سبکِ ہندی کہتے ہیں۔
(۲) بعض اسے سبکِ اصفہانی کہہ کر پکارتے ہیں۔
(۳) بعض سبکِ ہندی یا سبکِ اصفہانی کے علاوہ کوئی اور نام دیتے ہیں۔
(۴) بعض محققین اڑھائی سو سالہ عرصہ کی شاعری کے سبک کو ایک نام دینا کافی نہیں سمجھتے۔

لیکن ان کے مطابق فارسی زبان کے عہد حاضر اور عہد قدیم کے بہت سے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سبک کو سبک ہندی کہنا چاہیے(۱)۔ کیونکہ اس سبک کو سبکِ ہندی کہنے کی اہم وجوہات یہ ہیں کہ اس کا آغاز و انجام اور تحول و ارتقا برصغیر ہی میں ہوا اور اس سبک میں جن اہم اور نامور شعرا نے شاعری کی ان میں سے بیشتر کا تعلق برصغیر ہی سے تھا۔ خواہ وہ برصغیر سے تھے یا مہاجرت کر کے یہاں آئے۔ اس کے علاوہ نہ صرف برصغیر بلکہ ایرانی شعرا نے بھی اسی سبک میں شاعری کی۔ سبکِ ہندی کے شعرا میں ایک گروہ ایسا تھا جو فارسی زبان تھے لیکن کبھی بھی ایران نہیں گئے اور دوسرا گروہ ایسا بھی تھا جو ایران سے ہجرت کر کے برصغیر آیا۔(۲)

سبک ہندی کے بارے میں مختلف محققین نے الگ الگ آراء دی ہیں، لیکن عام رائے یہ ہے کہ نویں صدی ہجری میں تحول و ارتقا کی بنا پر سبک ہندی کا آغاز ہوا۔ براؤن، ذبیح اللہ صفا، حسین خطیبی اور چند دیگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سبک کا آغاز مولانا عبدالرحمٰن جامی (۸۱۷-۸۹۸ق) کے بعد سے ہوتا ہے اور یہ سبک بارہویں صدی ہجری میں اپنے عروج پر تھا۔ لیکن بعض محققین امیر خسرو دہلوی (۶۵۱-۷۲۵ق) جو فارسی زبان کے معروف شاعر تھے۔ جن کا تعلق خلجی اور تغلق عہد سے تھا کو سبکِ ہندی کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اس عظیم شاعر نے فارسی زبان کی تمام اصناف سخن میں شعر کہے۔ اگرچہ اس نے غزل میں سعدی شیرازی، قصیدہ میں کمال الدین اسمٰعیل اور مثنوی میں حکیم نظامی گنجوی کی پیروی کی ہے۔ لیکن اگر اس کے اشعار خاص طور پر وہ اشعار جو کسی کی پیروی میں نہیں ہیں، ان کا بغور مطالعہ

کریں تو ان میں سبک ہندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس کی اہم ترین وجوہات میں سے معاشرتی ماحول، ایران سے دوری اور فارسی زبان کا خاص نہ ہونا شامل ہیں۔

عہد حاضر کے بہت بڑے شاعر، دانشور، محقق اور تھران یونیورسٹی کے مایہ ناز استاد ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکنی سبکِ ہندی کے آغاز کے بارے یوں لکھتے ہیں:

یہ اختلاف عہد حاضر کے سبھی سبکِ شناسوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک کہتا ہے سبک ہندی خاقانی سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ بابا فغانی شیرازی سے شروع ہوتا ہے اور تیسرا کہتا ہے کہ رودکی سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ سب کچھ معلومات نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سبھی نظریات ادبی متون سے بخوبی واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔ اگر انہی کے نظریات پر چلتے ہوئے مزید بحث کی جائے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی سبکِ ہندی کے بانی تھے(۳)

خصوصیات (۴)

(۱) تشبیہ، استعارہ اور کنایہ فارسی شاعری کے قدیم ترین ارکان ہیں۔ لیکن اُن میں ہر صدی میں تبدیلیاں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ تبدیلیاں سبکِ ہندی کی غزل تک آ پہنچیں۔ ان میں سے اہم ترین تبدیلیاں الفاظ اور کلمات کی ہیں۔ سبکِ ہندی کے شعرا کی تشبیہات اور کنایات کی اساس تازگی اور تنوع پر ہے۔

(۲) تشخیص (Personification) یعنی کسی بے جان چیز کو انسانی صفت دینا اور یہ سبک ہندی کی غزل کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔

عشق از طلبِ صحبتِ رضوان بود آزاد
زهد است که دستِ هوسش در کمرِ اوست

(کلیات عرفی شیرازی، ج۱، ص ۳۶۵)

(۳) کسی شعر میں ارتباط اور لفظی تناسبات نمایاں فنی خصوصیات میں سے ہوتی ہیں اور

مراعات النظیر اس سبک کی غزل کی اہم خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔

دانۂ قابلِ نہ مزرعِ سبز فلکی نیستی برگ ، چہ از باد خزان می لرزی

(دیوان صائب تبریزی، ج۶، ص۳۲۲۴)

(۴) ایہام تقریباً سبھی زبانوں کی شاعری کی مروجہ صنعتوں میں سے ہے اور سبکِ ہندی کی غزل میں ایہام زیادہ تر دوافاہیم کی اساس پر یعنی فعل اور تراکیب فعل پر ہے، مثلاً در برم پوشیدن (لباس پہننا) اور چشم پوشیدن (صرف نظر کرنا)

در محیطِ حادثاتِ دھرمانندِ حباب
چشم پوشیدن لباسِ عافیت شد در برم

(دیوان مولانا بیدل دہلوی، ص۹۵۰)

(۵) اسلوب معادلہ سے مراد تمثیل نگاری ہے جس کے دونوں مصرعوں میں کوئی حرفی یا معنوی ربط نہ ہو یعنی کسی شعر کے ایک مصرع میں کوئی بات کی گئی ہو اور اس کے دوسرے مصرع میں اس کی دلیل کے لئے مثال دی گئی ہو۔ یہ سبکِ ہندی میں نمایاں نظر آتی ہے۔

روشن دلان خوش آمدِ شاہان نگفتہ اند
آیینہ عیب پوشِ سکندر نمی شود

(دیوان کلیم کاشانی، ص۴۴۰)

(۶) حس آمیزی، یعنی دو حسوں کا ملاپ، یہ مغلیہ عہد کے آغاز کی غزل میں کم دکھائی دیتی ہے لیکن مغلیہ دور کے اواخر میں اس کا استعمال زیادہ ہے۔

زبانِ تیغ او شیرین ادایی کرد در کام
بہ عنوانی کہ بی تابانہ بوسیدم دھانش را

(کلیات اشعار ملک الشعرا، طالب آملی، ص۲۱۹)

(۷) تناقض، یہ صفت فارسی شاعری میں سنائی سے شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اس کا استعمال بڑھتا گیا اور یہ بالخصوص سبک ہندی کی غزل میں نمایاں ہے۔

چون سمندر غوطه در دریای آتش خورده ایم
تا زروی آتشینِ او نقاب افکنده ایم

(دیوان صائب تبریزی، ج ۵، ص ۲۶۳۷)

(۸) تلمیح، جس سے مراد کسی داستان یا مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی سبکِ ہندی کے شعرا کے ہاں نمایاں ہے۔

هزاران کوهِ معنی کندم و گوهر بر آوردم
به سهو آخر صدای تیشهٔ زین کوهکن بشنو

(کلیات اشعار ملک الشعراء طالب آملی، ص ۸۳۳)

(۹) تجرید بھی سبکِ ہندی کی اہم خصوصیات میں شمار ہوتی ہے اور یہ بیدل دہلوی کے ہاں بکثرت ہے۔

گر به تسلیم وفا پافشرد طاقتِ عجز
باده از خون رگِ سنگِ کند شیشهٔ ما

(دیوان مولانا بیدل دہلوی، ص ۱۲۳)

(۱۰) اغراق، یہ سبک ہندی کے شعرا کے ہاں بہت نمایاں ہے۔

گر کامِ دل زگریه میسر شود ز دوست
صد سال می توان به تمنا گریستن

(کلیات عرفی شیرازی، ج ۱، ص ۷۹۱)

(۱۱) معما پردازی، صفوی دور کے اکثر شعرا "معما" کہنے میں مصروف تھے اور کچھ شعرا نے معمائی کے نام سے شہرت حاصل کی، مثلاً شہاب معمائی، نظام معمائی اور رفیعی معمائی وغیرہ۔

(۱۲) وابستہ ھای خاص عددی، یہ بھی سبکِ ہندی کی غزل کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔

با عقل گشتم هم سفر یك کوچه راه از بیکسی
شد ریشه ریشه دامنم از خارِ استدلالها

(دیوان صائب تبریزی، ج ۱، ص ۴۱۵)

(۱۳) تکرار قافیہ بھی اس سبکِ کے شعراء میں نمایاں ہے۔

(۱۴) سبک ہندی کی اہم ترین خصوصیات مشکل پسندی اور دور از ذہن افکار ہیں۔ قدیم شعراء کی شاعری میں آسان اور سادہ مضامین نظر آتے ہیں۔ لیکن سبک ہندی کی غزل میں ابہام زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

(۱۵) اس سبک کے شعرا نے اپنی تمام تر توجہ تازہ گوئی اور مضمون آفرینی کی طرف مبذول کی ہوئی ہے جس کی بنا پر یہ سبک دوسرے اسالیب سے نمایاں ہے۔

عشرتِ ما معنی نازك به دست آوردن است

عیدِ ما نازك خیالان را هلال این است و بس

(دیوان صائب تبریزی، ج۵، ص۲۳۳۴)

(۱۶) سبک ہندی کی غزل کے پیرو شعرا نے دقیق مضامین کے علاوہ بے شمار مطالب کو ایک شعر میں سمویا ہے، جسے بلاغت کہتے ہیں۔

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش
آن هم کلیم با تو بگویم چسان گذشت
یك روز صرف بستن دل شد به این وآن
روزِ دگر به کندنِ دل از این وآن گذشت

(دیوان کلیم کاشانی، ص ۲۴۸)

(۱۷) خاص تراکیب، نئی تراکیب کا استعمال اس سبک کی غزل کے امتیازات میں سے ہے۔

یك ز بانم من و نمی گویم
سخنی راکه پُشت و رو دارد

(دیوان کلیم کاشانی، ص ۳۸۳)

(۱۸) یاس وقنوطیت، سبک ہندی کی غزل میں یاس اور نا امیدی کا اظہار بہت پایا جاتا ہے اور یہ یورپ کی رومانوی شاعری سے زیادہ مشابہ ہے۔ رومانوی شاعری میں بھی یاس، شکست، ناکامی اور رنج بہت زیادہ نظر آتا ہے۔

اگر به نشوو نما یابی رسیده ایم این است
که خار پای دوانیده ریشه تا جگرم

(دیوان کلیم کاشانی، ص ۵۱۳)

(۱۹) سبک ہندی کے شعرا کے ہاں زندگی کے بارے احساسات وعواطف کا بیان نمایاں نظر آتا ہے۔

(۲۰) خیال بندی، اس سبک کے اکثر شعراء کے ہاں زندگی اور مظاہر زندگی کے ساتھ ذہنی روابط نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری میں دعوا ہے کہ ان کی فکر اور سوچ قوی اور مضبوط ہیں اس طرز میں جلال اسیر، کلیم کاشانی، صائب تبریزی، بیدل دہلوی اور ناصر علی سرہندی بہت شہرت رکھتے ہیں۔

فکرِ صیدِ خلق دارند زهدانِ گوشه گیر
خاکساری پردهٔ تزویر باشد دام را

(دیوان صائب تبریزی، ج ۱، ص ۲۰)

(۲۱) اس سبک کی غزل میں برائی، سودخوری، حرص اور لالچ کی سرزنش بہت نظر آتی ہے۔

گر به قسمت قانعی، بیش و کمِ دنیا یکی است
تشنه چون یك جرعه خواهد کوزه و دریا یکی است

(دیوان کلیم کاشانی، ص ۲۷۸)

(۲۲) سبک ہندی کے شعرا ظاہر پرست ملا کو معاشرتی فساد کا باعث قرار دیتے ہیں اور نیشدار باتوں سے مذاق کرتے ہیں۔

دانۂ بسیار درکار است بهرِ صیدِ خلق
حق به دستِ زاهد است از سبحه را صد دانه ساخت

(دیوان کلیم کاشانی، ص ۲۷)

(۲۳) اس سبک کے شعرا وحدت اور ترک تعصب کا بھی درس دیتے ہیں۔

(۲۴) اس سبک کے شعرا لوگوں کو فعالیت، سچائی، وفاداری اور جوانمردی کا درس دیتے ہیں۔

از ورطه میندیش که تا از کفِ اخلاص
دامانِ توکل بوده امید نجات است

(کلیات اشعار طالب آملی، ص ۳۴۰)

(۲۵) سبک ہندی کی غزل میں بالائی طبقے کے مظالم اور بے اعتنائی کے مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔

در سرء هوس افسر جمشد نداریم
ارزاتی ما باد کلاۂ نمدِ ما

(کلیات اشعار طالب آملی، ص ۲۲۵)

(۲۶) اس سبک میں اعلیٰ حکام اور مسند نشینوں کی بے انصافی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

دولتِ سنگدلان را نبود استقرار
سیل از کوه به تعجیل روان می گردد

(دیوان صائب تبریزی، ج ۴، ص ۱۵۹۰)

(۲۷) سبک ہندی کے شعرا نے آیات اور احادیث سے دوری اختیار کی ہوئی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) سبک سخنوری فارسی عصر صفوی راچہ بنامیم، دکتر غلامرضا شودہ، ناموارۂ دکتر افشار، ج۱، صص ۲۰۹-۲۲۴

(۲) محمد طالب آملی، شرح حال و آثار او، پایان نامۂ دورۂ دکتری محمد مرسلین، ص۴

(۳) شاعر آیینہ ھا، دکتر محمد رضا شفیعی کدکنی، ص۴۰

(۴) تحول شعر فارسی، زین العابدین موتمن، ص ۳۵۹؛ سبک ادبی صائب، پایان نامۂ دورۂ دکتری محمد مجدی، ص ۵۴؛ شعر العجم، شبلی نعمانی، ج۳، صص ۱۷-۲۲؛ تاریخ ادبیات در ایران، ذبیح اللہ صفا، صص ۵۲۱-۵۷۵، سبک ھندی و کلیم کاشانی، شمس لنگرودی، صص ۵۴-۹۷؛ شاعر آیینہ ھا، محمد رضا شفیعی کدکنی، صص ۳۷-۷۲؛ موج اجتماعی سبک ھندی، غلام فاروق فلاح، صص ۳۹-۱۶۳؛ دیوان ابو طالب کلیم ھمدانی؛ دیوان صائب تبریزی؛ کلیات عرفی شیرازی؛ کلیات اشعار ملک الشعراء طالب آملی؛ کلیات دیوان بیدل دہلوی۔

☆☆☆

منابع و مآخذ

☆ تاریخ ادبیات در ایران، ذبیح اللہ صفا؛ انتشارات فردوس، تھران، ۱۳۷۳ش

☆ تحول شعر فارسی، زین العابدین موتمن، کتابخانہ طھوری، تھران، ۱۳۷۱ش

☆ دیوان ابو طالب کلیم ھمدانی، مقدمہ تصحیح وتعلیقات محمد قھرمان؛ انتشارات آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۵ش

☆ دیوان صائب تبریزی، بہ کوشش محمد قھرمان؛ شرکت انتشارات علمی وفرہنگی، تھران، ۱۳۷۰ش

☆ سبک ادبی صائب؛ باتوجہ بہ ترکیبات تشبیھی، پایان نامۂ دورہ دکتری محمد مجدی؛ کتابخانۂ دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی، دانشگاہ تھران، ۱۳۵۳ش

☆ سبک سخنوری فارسی عصر صفوی راچہ بنامیم، دکتر غلام رضا ستودہ، ناموارۂ دکتر محمود افشار بہ کوشش ایرج افشار باھمکاری کریم اصفہانیان، ج۱، تھران، ۱۳۵۴ش

☆ سبک ھندی وکلیم کاشانی (گردباد شور جنون)، شمس لنگرودی، نشر مرکز، تھران، ۱۳۷۲ش

☆ شاعر آئینہ ھا، محمد رضا شفیعی کدکنی، انتشارات آگاہ، تھران، ۱۳۷۳ش

☆ شعرالعجم، علامہ شبلی نعمانی، نیشنل بک فانڈیشن، اسلام آباد، پاکستان

☆ کلیات عرفی شیرازی، بہ کوشش وتصحیح پروفیسر دکتر ولی الحق انصاری، انتشارات دانشگاہ تھران، تھران ۱۳۷۸ش

☆ کلیات اشعار ملک الشعراء طالب آملی، بہ اہتمام وتصحیح وتحشیہ طاھری شھاب، کتابخانہ سنائی، تھران

☆ کلیات دیوان مولانا بیدل دھلوی، باتصحیح خال محمد خستہ، خلیل اللہ خلیلی، بااھتمام حسین آھی، انتشارات مروی، ۱۳۶۶ش

☆ محمد طالب آملی، شرح حال وسبک اشعار وآثار او، پایان نامۂ دورۂ دکتری محمد مرسلین، کتابخانہ دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی، دانشگاہ تھران، ۱۳۳۸ش

☆ موج اجتماعی سبک ھندی، استاد غلام فاروق فلاح، انتشارات ترانہ، مشھد، ۱۳۶۹ش

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 91 - 104

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

عبدالعزیز البشری بحیثیت مزاح نگار

ڈاکٹر حارث مبین☆

Abstract:

Abdul Aziz al-Bashri is one of the great humorist of Arabic of our time. Arabic literature is rich in humor writing. There arose many humonists in Arabic Literature who made this genre equal to that of other literatures of the world. Abdul Aziz al-Bashri is also one of them. He died in 1943 in Egypt. He contributed to Arabic literature a lot and earned popularity in Arab world. He follow Arabic legendry writer al-Jahiz in his style and diction. This article is a study of Bashri's humourous contributions which feature classical Arabic literature, mordenrity and influence of western literature.

کہا جاتا ہے کہ انسان اور حیوان میں تفریق کرنے والی چیز ظرافت و مزاح ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ انسان کرۂ ارض کا واحد حیوان ہے جو ہنستا اور قہقہے لگاتا ہے اور اس طرح انسان کو حیوانِ ناطق کی بجائے حیوانِ ضاحک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اِنسان ہنسنے اور ہنسانے کے فن سے کب واقف ہوا، اس کے متعلق تو حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ظرافت و مزاح اس دُنیا میں اِتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

دُنیا کی سب سے قدیم تہذیب مصر کے باشندے تو یہ خیال کرتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عالم ہست و بود کو مسکراہٹ سے جنم دیا[1]۔ ہمیں دُنیا کی تمام قدیم متمدن اقوام کا ادب طنز ومزاح اور ظرافت و فکاہت سے مالا مال نظر آئے گا۔ اہل مصر و یونان اور چینیوں کے یہاں اس کے عمدہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

بعض مستشرقین کی رائے کہ قدیم عربی ادب طنز ومزاح سے خالی ہے، خلافِ حقیقت ہے[2]۔ بہت سی مثالیں جاہلی ادب سے پیش کی جاسکتی ہیں[3]۔ جاہلی شعراء کی ہجو گوئی میں جہاں ایک طرف طنز کے تیر ہیں وہاں دوسری طرف مزاح کی لطافت بھی ہے۔ عربی ادب کا عظیم نثر نگار ادیب جس نے طنز ومزاح کو شعوبیہ کی تحریک میں باقاعدہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور فکاہی ادب کی طرح ڈالی، وہ عباسی دور کا نابغۂ عصر انشاء پرداز ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ (۲۵۵ متوفی ھ) ہے۔ اس کی معروف کتب میں سے کتاب البخلاء، کتاب المضاحک، کتاب الملح والطرف، کتاب المزاح والجد اور کتاب التربیع والتدویر وغیرہ طنز ومزاح کے عمدہ ترین نمونوں سے بھری پڑی ہیں[4]۔ جاحظ نے اپنی قوتِ مشاہدہ، ہلکی پھلکی شکی طبیعت، خوش مزاجی اور ہجو گوئی کے فطری میلان کے باوصف مختلف معاشرتی کرداروں مثلاً: اساتذہ، موسیقاروں، گویوں اور کاتبوں کا خاکہ اُڑانے میں ظرافت وطنز کے فن کو بامِ کمال تک پہنچایا۔[5]

جاحظ حاضر دماغ اور ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ منہ پھٹ بھی تھا، اس کی زبان درازی سے رؤسا و امراء اور منصبِ خلافت بھی محفوظ نہ تھا۔ اپنے طنز ومزاح اور حاضر جوابی کے بارے میں خود کہتا ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی کسی نے لاجواب اور شرمندہ نہیں کیا، ماسوائے دو عورتوں کے۔ (واضح رہے کہ جاحظ پست قد، قبیح صورت، کریہہ المنظر اور اُبھری

ہوئی آنکھوں والا تھا) ہوا یوں کہ ایک دراز قد عورت جاحظ کے پاس آئی تو جاحظ نے بیٹھے ہوئے ہی اس کی طرف دیکھ کر کہا: ''انزلی کلی معنا'' (تو ساری کی ساری ہماری طرف اُتر)، اُس عورت نے برجستہ کہا: ''اِصعد أنتَ حتی تری الدنیا'' (تو اُوپر چڑھ تا کہ تُو دُنیا دیکھ سکے) جاحظ کے پست قد پر اس سے اچھی طنز اور کیا ہوسکتی تھی۔ جاحظ کہتا ہے کہ ایک دن میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا تو ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ آپ میرے ساتھ بازار چلیں، مجھے وہاں آپ سے ضروری کام ہے۔ میں اس کے ساتھ چل دیا، وہ ایک یہودی مجسمہ ساز کی دکان پر جا رُکی اور اُسے کہنے لگی: ''مثل ھذا'' (اس کی طرح کا) اور جاحظ کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ جاحظ نے مجسمہ ساز سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ اس نے کہا، یہ عورت میرے پاس آکر کہنے لگی کہ مجھے شیطان کی شکل کا ایک مجسمہ بنادو تو میں نے کہا، محترمہ میں نے تو شیطان کو کبھی نہیں دیکھا، پھر وہ تمہیں میرے پاس لے آئی(6)۔

طنز ومزاح میں ابوالعیناء، الحمدونی اور المعری عباسی دور کی نمایاں شخصیات ہیں۔

عصر حاضر میں عرب معاشرے کی اجتماعی وسیاسی اقدار میں تغیرات کے سبب جدید عربی ادب جن نئے رجحانات وترجیحات سے روشناس ہوا، طنز ومزاح کا اِن جدید احوال و ظروف سے متاثر ہونا فطری عمل تھا، لہٰذا مصر میں باقاعدہ فکاہیہ صحافت کی بنیاد پڑی اور اسماعیل پاشا کے دور میں یعقوب صنوع (۱۸۳۹ء۔۱۹۱۲ء) نے مشرق کے پہلے فکاہی جریدے ''جریدہ مسلیات ومضحکات'' کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد جریدہ ''ابونظارۃ'' پیرس اور بعد میں مصر سے جاری کیا(7)۔ جس میں عامیہ زبان اور کارٹون کے ذریعے سے اسماعیل پاشا کی سیاسی پالیسیوں کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا جاتا۔ اسماعیل پاشا کو شیخ البلد، شیخ الحارۃ (شیخ محلّہ) اور فرعون کے لقب سے پیش کیا جاتا تھا جبکہ یعقوب صنوع خود کو ''ابونظارۃ'' اور مصری

کسان کو ''الفلاح المصری'' کے کردار میں پیش کرتا[8]۔

اس کے بعد مصر کے معروف مزاح نگار عبداللہ ندیم (۱۸۴۵ء۔۱۸۹۶ء) نے ۱۸۸۱ء میں ''التنکیت والتکبیت'' کے نام سے ایک فکاہیہ مجلّہ جاری کیا، جس نے طنز ومزاح کو نئی جہت دی۔ عبداللہ ندیم ۱۸۹۲ء میں ''الاستاذ'' کے نام سے نیا مجلّہ شائع کیا جس میں فصحی کے ساتھ ساتھ عامیہ زبان میں بھی مضامین شائع ہوتے[9]۔ ارغول، حمارة منیتی، خیال الظل، مجلة السیف، البعکوکة، کشکول اور مجلة الفکاهة نے فکاہی ادب کو عربی زبان میں نیا اسلوب عطا کیا[10]۔

جدید عربی ادب میں طنز ومزاح کو جس خوبصورت اسلوب سے عبدالعزیز البشری نے روشناس کرایا، وہ اُسے دیگر ہم عصر ادباء میں ممتاز کرتا ہے۔ عبدالعزیز البشری ۱۸۸۶ء میں شیخ سلیم البشری کے یہاں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد دو مرتبہ شیخ الازہر کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس طرح بشری کو روایتی علوم کی تعلیم وتربیت ورثے میں ملی۔ اوائلِ عمر میں قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد جامعہ الازہر میں بنیادی دینی علوم، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی[11]۔ بشری نے ایک طرف روایتی علوم کی تعلیم حاصل کی تو دوسری طرف اس دور میں جامعہ الازہر میں احیاء وتجدید کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ عبدالعزیز نے کھلے دل و دماغ سے ان اثرات کو قبول کیا، اسی دور میں مصر کے مشہور ادیب المویلحی (۱۸۵۸ء۔۱۹۳۰ء) نے مشہور ہفت روزہ ''مصباح الشرق'' جاری کیا جس نے انیسویں صدی کی عرب شخصیات کے فکر وفن پر مغربی طرزِ اسلوب پر نقد وجرح کی طرح ڈالی۔ بشری اس اسلوبِ تنقید سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے اسی طرز پر بعض تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ وہ وزارتِ اوقاف اور وزارتِ تعلیم میں کچھ عرصہ سیکرٹری

رہے۔ انہوں نے شرعی عدالت میں بھی خدمات انجام دیں۔ آخری عمر میں اکادیمی برائے عربی زبان، قاہرہ کے سربراہ رہے اور اسی ذمہ داری کو انجام دیتے ہوئے ۲۵ مارچ ۱۹۴۳ء داعیٔ اجل کو لبیک کہا[12]۔ ذیل میں عبدالعزیز البشری کے ادبی آثار کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

فی المرآۃ:

یہ بشری کے مختلف مشاہیر علم و ادب کے سوانحی خاکوں پر مبنی مجموعہ ہے جو "السیاسة الاسبوعیة" میں مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں دارالکتب المصریة نے اسے کتابی صورت میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اس کتاب کے مقدمہ سے پہلے مؤلف انتساب کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اُن حضرات کے نام جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے، یقیناً آپ لوگ ہی اس کے مستحق ہیں کہ اسے آپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ آپ میں سے جو کوئی اس آئینہ میں اپنا عکس دیکھے اور اُسے اپنی تصویر عجیب لگے تو وہ اللہ کی حمد وثناء کرے جس نے اس کی صورت کو یوں بنایا ہے، میرا کام تو محض اس تصویر کی نقل دکھانا اور عکاسی کرنا ہے''۔

ان خاکوں میں بشری نے مختلف سیاسی، ادبی، معاشرتی اور دینی شخصیات کو تختۂ مشق بنایا ہے، ان تمام مشاہیر کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے بشری نے اِن کے ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھا اور پھر اپنے فکاہیہ طرزِ اسلوب کے ساتھ الفاظ کے آئینہ میں ان تصاویر کو جلابخشی، ان مشاہیر میں عدلی یکن، سعد زغلول، مجوب ثابت، احمد لطفی السید، حافظ رمضان، حافظ ابراہیم، اسماعیل صدقی، عزیز عزت پاشا، احمد شوقی اور محمد محمود وغیرہ جیسی معروف شخصیات شامل ہیں۔

المختار:

یہ کتاب بشری کے مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف ادبی مجلّات اور اخبارات میں

شائع ہوتے رہے۔ بشری نے مرض الموت کے دوران میں دوستوں کے مشورے سے ان مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی اجازت دی جسے دو اجزاء میں شائع کیا گیا۔ پہلا جزء تین اقسام پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں عربی ادب کے مختلف ادوار میں ترویج و ترقی اور عربی تنقید پر بحث کی گئی ہے۔ دوسری فصل بشری کی انشائیہ تحریروں کا احاطہ کرتی ہے۔ جبکہ احمد شوقی کی شاعری پر چند تنقیدی مضامین بھی اسی فصل میں شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں چند مشاہیرِ علم و ادب کے سوانحی خاکے شامل ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا جزء دو ابواب پر مشتمل پہلے باب میں کلمۂ فن پر بحث کی گئی ہے، پھر فنِ بلاغت اور فنِ موسیقی پر تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ دوسرا باب مزاح، لطائف و ظرافت پر مشتمل ہے اور آخر میں مصر کے بلند پایہ مزاح نگاروں کے فن پر بحث کی گئی ہے۔

قطوف:

یہ کتاب اس کے دینی و معاشرتی علوم پر مقالات کا مجموعہ ہے جسے اس کی وفات کے بعد مصر کے معروف ادیب و نقاد طہ حسین نے اپنے وقیع مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

التربية الوطنية:

یہ کتاب بشری نے ۱۹۲۸ء میں اس وقت لکھی جب وہ وزارتِ تعلیم میں سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کتاب قومی تعلیم و تربیت کے موضوع پر ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب عرصۂ دراز تک مصر کے نصابِ تعلیم کا حصہ رہی۔[13]

عبدالعزیز البشری اپنے حلقۂ رفقاء میں حسن اطوار، شائستگی، شیریں بیانی، مزاح گوئی اور حسِ ظرافت کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ اپنے لطائف سے روتے ہوئے کو ہنسانا اور غم زدہ دلوں میں گدگدی کرنے میں بشری کو کمال حاصل تھا[13]۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ

ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عبدالعزیز بشریٰ عصبی المزاج اور تند خو واقع ہوا تھا۔ روانی طبع اور جولانی اسلوب میں وہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی رگید ڈالتا تھا، اسی لئے اس کا حلقۂ احباب بھی اس کی زبان درازی سے محفوظ رہنے کے لئے بہت محتاط رہتا۔ بشری خود اپنے ایک قائد دوست کے بارے میں ذکر کرتا ہے کہ جب اُسے کسی نے ایک رات اطلاع دی کہ بشری کا مضمون اس کے بارے میں اگلے دن کے "مرآة السياسة الاسبوعية" میں شائع ہورہا ہے تو وہ بوجہ اضطراب رات بھر سو نہ سکا اور اگلے دن مضمون پڑھتے تک مضطرب رہا(14)۔

بشری نے دُنیا کو بڑے قریب سے دیکھا وہ ہر قسم کی مجالس ومحافل میں حاضر ہوتا اور اس کے حلقۂ احباب میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ شامل تھے۔ ادیب وصحافی، علماء وصوفیاء، فن کار ومغنی ہر ایک کے ساتھ گاڑی چھنتی تھی۔ ایک جگہ پر جم کر بیٹھنا اس کے مزاج میں نہ تھا، اس کے لیل ونہار قاہرہ کے اطراف واکناف میں مختلف مجالس اور قہوہ خانوں میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں گزرتے۔ بقول طہ حسین:

''بشری ان لوگوں میں سے تھا جنہیں ایک جگہ قرار نہیں اور مادی ومعنوی تغیر وتنقل اُن کی گھٹی میں ہوتا ہے''(15)۔

مصر میں ادبی انجمن اور کلب کا رواج انیسویں صدی کے آخری عشروں اور بیسویں صدی کے ابتداء میں عام ہوا، ان کلبوں میں ہفتہ میں دو یا تین ادبی نشستیں ہوتیں جن میں نامور ادباء وشعراء حصہ لیتے۔ نثر وشعر اور فن ونقد کی ترویج میں ان مجالسِ ادبیہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان ادبی مجالس میں ایک اہم ترین مجلس ''امیرۃ نازلی فاضل'' کا کلب تھا، جو مصر میں ترقی پسند خواتین کی سرخیل اور عالمِ عرب میں آزادئ نسواں کی تحریک کی روحِ رواں تھی، قاسم امین (۱۸۶۳ء۔۱۹۰۸ء)، جو مصر میں آزادئ نسواں کی علامت شمار ہوتا ہے، نے نازلی کی تحریک پر ہی ''تحریر المرأۃ'' لکھی، جس نے مصر کے دینی اور علمی حلقوں میں

ہلچل مچادی[16]۔ امیرۃ نازلی کے کلب اور دوسرے کئی ایسے ادبی وعلمی مراکز تھے، جن سے عبدالعزیز بشری فیض یاب ہوتا رہا۔ قہوہ خانوں میں بھی شام کے بعد ادبی محفلیں جمتیں، جیسا کہ ہمارے یہاں لاہور میں پاک ٹی ہاؤس اور شیزان میں ادباء وشعراء جمع ہوا کرتے تھے، قاہرۃ میں بار اللواء یا قہوۃ اللواء معروف ترین قہوہ خانہ تھا، جہاں مشاہیر ادب جمع ہوتے اور ان میں بشری کے ساتھ فکاہیہ مجلّہ کشکول اور السیاسۃ الاسبوعیۃ کے ایڈیٹر بھی بیٹھتے اور رات گئے تک ادب وفن کے ہر پہلو پر بحث ہوتی[17]۔ طنز وظرافت کے تیر چلتے اور مزاح کے کتنے ہی نثر پارے یہیں تخلیق ہوتے۔

عبدالعزیز البشری موسیقی کا اوائلِ عمر سے ہی بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے ہم عصر فنکاروں سے گہرے مراسم استوار کئے اور فن موسیقی کے ساتھ اس کی وابستگی صرف سماعت کی حد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس نے اِس فن میں قدرتِ تامہ حاصل کی۔ مختلف اساتذۂ فن سے کسبِ فیض کیا جن میں عبدہ الحامولی، محمد عثمان اور عبدالحئ حلمی سرفہرست ہیں[18]۔

بشری کی فکری وادبی تربیت میں دوعوامل کا اہم ترین کردار ہے، اس نے الازہر کی روایتی دینی فضاء میں تعلیم حاصل کی جہاں ابھی جدید رجحانات کا عمل دخل عام نہ ہوا تھا اور مغربی اسالیبِ ادب وتنقید نے پذیرائی حاصل نہ کی تھی، مگر جامعہ مصریہ کے افتتاح سے قاہرہ کے علمی وادبی حلقوں میں جدیدِ مغربی رجحانات کی آبیاری ہوئی اور بشری نے اس نئی فضاء سے کھلے دل ودماغ اور روشن فکروعقل کے ساتھ استفادہ کیا۔ اسے براہِ راست جامعہ مصریہ (بعدازاں جس کو ۱۹۲۵ء میں جامعہ فواد اول کا نام دیا گیا) میں داخل ہوکر مستفید ہونے کا موقع تو نہ ملا مگر وہ جامعہ کے اساتذہ وطلباء سے مسلسل رابطے میں رہا اور ان کے ادبی وعلمی افکار وخیالات سے استفادہ کرتا رہا۔ جامعہ مصریہ کے لطفی سید، طہ حسین اور زکی

مبارک جیسے عظیم ادباء کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے اور بشری کے فکر وفن میں جدت پسندی کے عنصر کو اجاگر کرنے میں ان مشاہیر کی صحبت کا گہرا اثر تھا[19]۔

دار الکتب المصریة نے بھی بشری کی علمی و ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ادارے کی بنیاد علی مبارک نے ۱۸۷۰ء میں رکھی۔ اس ادارے نے مصر کی نئی نسل میں علم وادب کی ترویج واشاعت میں اہم ترین کردار ادا کیا[20]۔

بشری کے والد شیخ سلیم بشری دارالکتب کی لغوی انجمن کے صدر بھی رہے، اس لئے یہاں پر بشری کو اپنی علمی تشنگی کی تسکین کا بھرپور موقع ملا۔ اس نے جدید مغربی ادب کے تراجم کا یہیں مطالعہ کیا، جس نے اس کے اندر جدید ادبی رجحانات کو جلابخشی اور وہ طنز ومزاح کے نئے اسالیب اور پیرایۂ ظرافت سے متعارف ہوا[21]۔

بشری کی ادبی تربیت اور فکری تثقیف میں ایک مؤثر ترین عنصر مصر میں ھزلی صحافت کا ظہور بھی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کی ابتداء میں عرب دُنیا میں پریس میڈیا کے توسط سے ایک انقلاب برپا ہوا اور صحافت کی دُنیا میں الھلال، الاحرام، مقتطف، الرسالة اور السیاسة الاسبوعة منصۂ شہود پر آئے۔ ادبی و سیاسی صحافت کی ترویج نے ھزلی اور طنزیہ صحافت کی راہ ہموار کی اور سیاسی ومعاشرتی کمزوریوں کو عیاں کرنے کے لئے ادباء اور صحافتوں نے فکاہیہ صحافت کی بنیاد رکھی۔ عوامی احساسات و جذبات نے فکاہی وسخریائی اسلوب میں اپنی نمود کا راستہ تلاش کیا۔ یعقوب صنوع کا ابونظارہ اور عبداللہ ندیم کا التنکیف والتبکیت اسی دور کی یادگار ہیں۔ بشری کی حس مزاح کو جلا بخشنے میں ان مزاحیہ مجلّات کا اہم کردار ہے، وہ ان مجلّات کو ایک عرصہ تک پڑھتا رہا اور پھر ان میں فکاہی کالم ومضامین تواتر لکھتا رہا[22]۔

بشری کی مزاحیہ اور طنزیہ تحریروں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح

ہوجائے گی کہ اس کی تحریر کے پس منظر میں تین تکوینی عناصر کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک تو وہ خالص عربی عنصر ہے جو جامعہ ازہر میں کلاسیکی عربی ادب کی تعلیم کے توسط سے اس کے مائل بہ مزاح طبیعت میں راسخ ہوا۔ عربی ادب کے کلاسیکی نثر پاروں کے مطالعہ کے دوران میں اسے سب سے زیادہ جاحظ کی تحریروں نے متاثر کیا، جبکہ اس نے اسی دور میں الاصفہانی، ابوالعینا، الحمدونی اور المعری کے فکاہیہ اور طنزیہ اسلوب سے فائدہ اُٹھایا۔ جاحظ کی طنزیہ اور فکاہیہ تحریروں کا اس نے بار بار مطالعہ کیا اور اس کے اسلوب کو نقل کرنے کی کوشش کی۔ خود بشری اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''عرصۂ دراز سے میں جاحظ کے اسلوب سے شناسا ہوں، اس کے پرجلال لہجہ، شکوہِ اسلوب اور ندرتِ فکر نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا۔ اس کے اسلوب میں حد درجہ جدت، تمکنت، نزاکت اور جمال جلوہ گر ہے۔ اس کا سلیس ورواں اسلوب فکاہی انداز سے کسی چیز کی تصویر کشی کرتا ہے تو وہ چیز قاری کے سامنے مجسم بن کے رہ جاتی ہے[23]۔

بشری اپنے تند و تیز طنز اور رواں اسلوب میں جاحظ کا شاگردِ رشید ثابت ہوا اور اسی سے اُس نے بخل و مفت خوری کے موضوعات، استطرادِ موضوع کا فن اور سنجیدگی کو مزاح کی آمیزش دینے کا گر سیکھا۔ اس کے مزاح میں دوسرا عنصر خالص جدید مصری ادب کی اثر پذیری ہے، اس نے انیسویں صدی کے ادباء و مشاہیر کی تحریروں کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا، جبکہ ابراہیم المویلحی اور اس کے بیٹے محمد المویلحی کی تحریروں اور ان کے مجلّہ ''مصباح الشرق'' نے بشری کو بہت متاثر کیا۔

بشری ابراہیم المویلحی کے اسلوبِ طنز و مزاح اور شخصیات کے خاکے اُڑانے میں بہت متاثر ہوا۔ اسی طرح بعد میں جریدہ ''المؤید'' کے ایڈیٹر علی یوسف کے اسلوبِ مزاح نے اس کی ادبی تربیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ابونظارۃ اور التنکیت والتبکیت جیسے مجلّات کے فکاہی وھزلی اسلوب اس کی ادبی زندگی میں اثر پذیری کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

عبدالعزیز البشری کے مزاح میں تیسرا عنصر مغربی ادب کی اثر پذیری ہے، اس نے مغربی آداب کے تراجم کا مطالعہ اور فرانسیسی زبان و ادب کو براہِ راست پڑھا۔ فرانسیسی مزاحیہ ادب کے مطالعہ کے دوران میں اُس نے بہت سی چیزیں اخذ کیں اور اپنی تحریروں میں فرانسیسی جملوں کا تڑکا لگاتا، اپنے دور کے ایک وزیر زیور پاشا کے بارے میں لکھتا ہے: ''زیور پاشا کی ریاست سے خیر خواہی کا اندازہ آپ کو تب ہوگا، جب آپ حکومت کے اسراف اور عوامی مال و دولت کو بے دریغ لٹانے پر تنقید کرتے ہیں تو وہ فوراً کہتا ہے: (L, Egypt est riche) یعنی ''مصر امیر تو ہے ناں''۔ شخصیات کے مزاحیہ سوانحی خاکے لکھنے میں بشری کو شہرتِ دوام ملی اور اس کے مزاحیہ اسلوب میں مغربی طرزِ اسلوب کی نمایاں آمیزش نظر آتی ہے[24]۔

بشری کے مزاج میں مزاحیہ تکوینی عناصر میں سے اس کی شکل وصورت کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ ماہرینِ نفسیات و فلاسفہ نے مزاح کے تین محرکات بیان کئے ہیں: برتری کا احساس (Superiority)، غیر مطابقت (Incongruity) اور دباؤ کی تخفیف (Relief of Tension)[25]۔ غیر مطابقت میں انسانی اعضاء کا عدمِ توازن بھی شامل ہے۔ حقیقی مزاح نگار تو وہ ہوتا ہے جو خود پر قہقہے لگا سکے۔ بشری کی ہیئتِ کذائی کا اس کے مزاحیہ اسلوب میں بڑا عمل دخل تھا۔ اس کا بے ہنگم لانبا قد، کبڑی کمر، بکھرے گھنگھریالے بال، سرخ موٹی آنکھیں، پھیلے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ اور ان کے پیچھے بے ترتیب دانت اور سب سے بڑھ کر کالا رنگ، اس کی شخصیت کا مسخرانہ تاثر اُبھارتے تھے۔ انسان کے نقش و نگار اور ظاہری صورت کا بھی اُس کے مزاج پر اثر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جاحظ اور عصرِ حاضر کے بلند پایہ عرب مزاح نگار عبدالقادر المازنی اور امام العبد کی مثال دی جاسکتی ہے[26]۔

بشری جاحظ کی طرح شخصیات کا خاکہ اُڑانے میں مختلف اعضاء کو ہدفِ طنز بناتا ہے۔ کسی شخصیت کا انتہائی نحیف یا پھر ضخیم ہونا، پست قد یا طویل القامت ہونا، آنکھ، ناک، کان اور گنجا ہونے کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کی کتاب فی المرآۃ میں شخصی خاکوں میں یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

وہ مصر کی معروف سیاسی شخصیت عبدالحمید سعید کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''وہ لغوی معنی میں عبقری (کثیر الالوان وکثیر الجہات) شخصیت کے مالک ہیں۔ لانبوں میں سب سے لمبے اور چوڑوں میں سب سے چوڑے، ڈیل ڈول میں اتنے دیوقامت کہ ہیاکل سلیمانی میں سے کوئی ہیکل کھڑا ہو، بھاری بھرکم چہرہ کہ جس کے اردگرد داڑھی کا جنگل منڈلاتا رہتا ہے، جسے کسی قینچی یا کٹر سے تراش خراش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی، اس کے چوڑے چکلے سینے میں اس کے ضخیم و لحیم جسم کی طرح مضبوط توانا، پرعزم دل ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔[27]

بشری عصر حاضر میں مصری معاشرہ میں پائی جانے والی کمزوریوں، امراء کی ریاکاری و مکاری اور عوام کی جہالت و نااہلی پر تنقید کرنے والے ادباء میں سے سب سے بڑا ناقد ہے۔ وہ معاشرے کی فرسودہ روایات اور معاشرتی رواجات کی مزاحیہ انداز میں اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ وہ نشتر لگانے کے ساتھ ساتھ زخموں پر مرہم بھی رکھ جاتا ہے۔ بشری نے ہر طبقہ فکر کے عیوب اور در پردہ حقائق کو اس طرح ہلکے پھلکے انداز سے پیش کیا ہے کہ خلش کم اور گداز زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ مذہبی رہبر، سیاسی قائد، طبیب، پروفیسر، جج اور وکیل ہر پیشہ ور کی خامیوں کو اجاگر کرنے میں ماہر نظر آئے گا۔

☆☆☆

حواشی

(۱) سها عبدالستار السطوحی، دکتورة: السخرية فی الأدب العربی الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص : ۱۱

(۲) محمد خلف الله احمد: دراسات فی الادب الاسلامی، دارالمعارف، القاهرة، مصر، ۱۹۴۷ء، ص:۱۳۸

(۳) طه، د. نعمان محمد امين: السخرية فی الادب العربی، دارالتوفيقية، القاهرة، الطبعة الاولی، ۱۹۷۸ء، ص:۵۸.۶۸.

(۴) ایضاً، ص:۱۵۳

(۵) محمد کاظم: عربی ادب کی تاریخ دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۱۸۳

(۶) طہ، د نعمان محمد امین: السخریۃ فی الادب العربی، ص:۱۵۴

(۷) حمدی السکوت، دکتور: قاموس الأدب العربی الحديث دار الشروق، القاهرة، مصر، الطبعة الأولی، ۲۰۰۷ء، ص۶۱۸

(۸) سها عبدالستار السطوحی، دکتورة: السخرية فی الأدب العربی الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص : ۱۵

(۹) نوفل، د. يوسف حسن: الأ'ب الحديث فی العالم العربی و مصادر دراسه، الشركة المصرية العامة، لونجمان القاهرة، مصر، الطبعة الأولی ۲۰۰۸ء، ص:۲۰۳.

(۱۰) سها عبدالستار السطوحی، دکتورة: السخرية فی الأدب العربی الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص : ۳۰-۲۹

(۱۱) خفاجی، د. محمد عبدالمنعم: صفحات من الفكر المصری العربی، مكتبة الأنجليز المصرية، القاهرة، مصر، ۲۰۰۰ء، ص :۱۴۶.

(۱۲) الزركلی، خيرالدين: الأعلام، دارالعلوم للملايين، بيروت، لبنان، الطبعة السابعة مايو

۱۹۸۶ء المجلد الرابع، ص :۱۸

(۱۳) سها عبدالستار السطوحى، دكتورة: السخرية فى الأدب العربى الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص :۸۱

(۱۴) أيضاً،ص:۸۳

(۱۵) البشرى، عبدالعزيز: قطوف، دارالكتاب المصرى، القاهرة، مصر، الطبعة الأولى، ۱۹۴۷ء، ج: ۱، ع المقدمة.

(۱۶) سها عبدالستار السطوحى، دكتورة: السخرية فى الأدب العربى الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص :۸۶

(۱۷) أيضاً،ص:۸۷

(۱۸) أيضاً،ص:۸۳

(۱۹) أيضاً،ص:۸۴

(۲۰) حمدى السكوت، دكتور: قاموس الأدب العربى الحديث دار الشروق، القاهرة، مصر، الطبعة الأولى، ۲۰۰۷ء، ص۲۰۳

ــــو التنوجى، محمد: المعجم المفصل فى الأدب، دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية، ۱۹۹۹ء، ج:۲، ص:۴۳۲

(۲۱) سها عبدالستار السطوحى، دكتورة: السخرية فى الأدب العربى الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص :۸۵

(۲۲) ایضاً،ص:۸۶

(۲۳) ایضاً،ص:۹۰

(۲۴) ایضاً،ص:۹۴:۹۲

(۲۵) پاریکھ، ڈاکٹر رؤف: اُردو نثر میں مزاح نگاری، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، طباعت اوّل ۱۹۹۷ء، ص:۱۵

(۲۶) سها عبدالستار السطوحى، دكتورة: السخرية فى الأدب العربى الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص :۱۱۰

(۲۷) سها عبدالستار السطوحى، دكتورة: السخرية فى الأدب العربى الحديث، الهيئة المصرية العامة الكتاب، القاهرة، مصر، ۲۰۰۷ء، ص :۱۴۱

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 105 - 118

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

فارسی و پاکستان

ڈاکٹر محمد ناصر☆

Abstract:

It is now more than one thousand years that the sweet and attractive Persian has captured the hearts and minds of the people of the mysterious land, called sub-continent. Nevertheless it is quite evident to evreryone that Persian has gone under immense stress during the past thirty years. The 21st century is rightly called the age of computer and technology and preferences of the common people have changed dramatically. The cultural invasion of Europe has influenced every walk of life and the necessaties of the modern age e.g. computer, internet, cellular phones and excessive number of television channels have taken our younger generation at distance from religious, cultural, social and moral values.

Key words: Persian, Subcontinent, Past 25 years, Analysis.

چکیدہ

بیش از هزار سال می گذرد که زبان شیرین و دلنشین فارسی قلوب و اذهان مردم شریف سرزمین مرموز شبه قاره را به دست آورده است، اما از کسی پنهان نیست که در ربع قرن اخیر بعموم و در دهه اخیر بخصوص فارسی با مشکلات بی سابقه ای رو به

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

رو شد. در قرن حاضر که زمان فناوری و رأیانه ای خوانده می شود، ارجحیت های مردم بکلی تغییر یافت. تهاجم فرهنگی اروپا در همۂ شؤنات زندگی تأثیر گذاشت و رأیانه، اینترنت، شبکه های تلویزیونی و تلفن همراه نژاد جوان ما را از ارزشهای دینی، مذهبی و اخلاقی بقدری دور ساخت و اگر راست بگوییم بزرگسالان هم از وظیفۂ اساسی تربیت جوانان غافلگیر شدند. بدون شک و تردید زندگی به سرعت جلو رفت و متأسفانه ارزشها عقب ماندند. اما باید پذیرفت ما نیز برای مقاومت در برابر مشکلات موجود بدون هیچ آمادگی و برنامه ریزی بیرون آمدیم. در مقالۂ حاضر نقاط ضعف در ترویج و احیای فارسی در شبه قاره در ربع قرن اخیر مورد بررسی علمی پژوهشی قرار گرفته و نویسنده نقش استادان، پژوهشگران، دانشجویان، مسؤلان فرهنگی، دست اندرکاران امور اجرایی و سیاست های دولتی را به باد تند نقد سپرده و افزون بر آن امکانات حاضر را ذکر کرده و برای ترویج زبان بزرگان و نیاگان و احیای دوره طلایی ادب گرانسنگ فارسی پیشنهاد های عملی و ارزنده ای ارایه داده است.

واژگان کلیدی: فارسی، شبه قاره، ترویج، بر رسی نقاط ضعف، امکانات، پیشنهاد ها

فارسی از قدیمترین زبانهای جهان ومهمترین زبانهای جهان اسلامی به حساب می آید. اگر بر تاریخ زبان فارسی، حتی نگاهی گذرا بیندازیم، حقایق بسیار جالب توجۂ ما را به خود اختصاص می دهد. به عنوان مثال در حدود دو هزار و پانصد سال پیش در دوران امپراتوری پرشکوه هخامنشیان (۵۵۹ الی ۳۲۱ پیش از میلاد مسیح)، زبانی که در ایران بدان تکلم می شد، زبان شناسان امروزی آن را "فارسی باستان" می نامند.(ابوالقاسمی، محسن، ۱۳۷۳ش، ص۱۸) اسکندر مقدونی (د.۳۲۳ ق م)، داریوش سوم (د. ۳۳۱ ق م)، آخرین پادشاه هخامنشیان، را شکست داد و بساط امپراتوری هخامنشی را درنورد.(رازی، عبدالله، ۱۳۷۲ش، ص۲۰) و سرزمین پهناور ایران عزیز به دست یونانی ها افتاد. اسکندر مقدونی در عالم جوانی داعی اجل را لبیک گفت و رخت از جهان بربست، و در نتیجه اش منطقۂ فارسی زبان امپراتوری

اسکندر را سلوکوس(د. ۲۸۱ یا ۲۸۰ ق م) به دست گرفت.(پیشین، ص۳۴) اما بیش از هشتاد سال نگذشته بود که ایرانیان جسور و غیور بیگانگان را از خاک پاک خود بیرون راندند(پیشین، ص۴۲) و سلطنت اشکانیان پای به عرصهٔ وجود گذاشت، و ایرانیان زمام اقتدار خویش را به دست خود گرفتند.(پیشین، ص ۵۱) زبان شناسان سرشناس، زبان دوران اشکانی (۲۵۰ ق م الیٰ ۲۲۶ م) را به نام پهلوی اشکانی یا پهلوی شمالی (ابوالقاسمی، محسن، ۱۳۷۳ش، ص۲۰۳) می شناسند. در دوران پیش فارسی باستان را در خط میخی(۱) می نوشتند،(پیشین، ص۳۵) اما برای نوشتن پهلوی اشکانی خط پهلوی اختراع شد.(پیشین، ص۲۰۳) اردوان پنجم (دوران خکومت: ۲۱۶ الی ۲۲۶م)، آخرین پادشاه دوران اشکانی از اردشیر بابکان (دوران خکومت: ۲۲۴ الی ۲۴۱م) شکست خورد امپراتوری ساسانی تأسیس گشت.(رازی، عبدالله، پیشین، ص۱۰۴) در این دوره ایران بارِ دیگر در زمینهٔ ارتشی، فرهنگی و اقتصادی پیشرفت شایانی کرده ابرقدرتِ جهان گشت.

امپراتوری ساسانی بر اساسِ دین زرتشتی تأسیس شده بود، بنا بر این در دورانِ ساسانی دین زرتشتی در خاک ایران ریشه گرفت. در زمان انوشیروان عادل (دوران حکومت: ۵۳۱ الیٰ ۵۷۹م)، پادشاه نیکنام ساسانیان، پیامبر گرامی حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه وآله وسلم مبعوث شد.

دین مبین اسلام صحرا نشینان سرزمین حجاز را با ارزشهای وزین اخلاقی آشنا کرد، و دیری نگذشت که خورشید اسلام سرزمین ایران را روشن و منوّر ساخت.(پیشین، ص۱۳۸)

مردم نجیب و نیک سرشت ایران عزیز دین حق را از تهِ قلب پذیرفتند، و بزودی سراسر ایران حلقه به گوش اسلام گشت. در دورانِ ساسانی (۲۲۴ الیٰ ۶۵۲م) پهلوی ساسانی یا پهلوی جنوبی مروّج بود، امّا با ورودِ مسعودِ دین اسلام کلمات و واژگانِ عربی بسرعت واردِ زبانِ پهلوی شدند، و در نتیجهٔ آن زبانِ پهلوی

متحوّل گشت و خطِ پهلوی بنا بر دشوار بودنش یواش یواش متروک گشت.(ابوالقاسمی، محسن، پیشین، ص۲۰۴ ببعد) و ملّت شریف ایران در همان اوایل خط عربی را، با کمی تغییر، پذیرفت. بنا بر عشق و علاقه با دینِ حق و کلام اللّٰه، خط جدید فارسی در طولِ ایران قبولیت یافت و تا امروز رایج است.(صفا، ذبیح اللّٰه، ۱۳۷۳ش، جلد اوّل، صص ۱۴۰ الی ۱۵۶)

اغلب در مورد تفاوت در میانِ فارسی باستان، پهلوی و فارسی امروزه سؤال می کنند. پاسخ این پُرسشِ مهم بسیار ساده و آسان است یعنی اگر از فارسی امروزه کلمات و تراکیب عربی اخراج و واژگان و اصطلاحات پهلوی وارد شود، مبدّل به همان پهلوی می گردد؛ و بالعکس اگر در پهلوی قدیم کلمات عربی شامل شود، پهلوی پیراهن نوین فارسی امروزه به تن می کند.(ابوالقاسمی، محسن، پیشین، ص۲۸۳ ببعد)

پیوند مهر و دوستی میان زبان فارسی و شبه قاره قدیم و عمیق و ناگسستنی است. حتّٰی در دوران پیش از اسلام نیز میان ایران و شبه قاره روابط دوستانه برقرار بود.(یمین خان، ۱۹۷۱م، صص ۲۱ الی ۲۶) امّا پس از ورود اسلام در شبه قاره چنین روابط گسترده تر شد.(پیشین، صص۲۷ الی ۳۱)

در ابتدا، بویژه در دوران حملات سلطان محمود غزنوی (دوران حکومت: ۳۸۷الٰی ۴۲۱ ه ق) و پس از آن عدهٔ زیادی از صوفیان و عارفان و بازرگانان مسلمان واردِ شبه قاره شدند.

تعلیمات طلایی و ارزشهای زرّین اسلامی بقدری ساده و جذّاب بود مردم بومی دین اسلام را با قلب باز پذیرفتند.عارفانی که در شبه قاره برای گسترش و ترویج اسلام خدمات شایانی و فراموش نشدنی انجام دادند، اغلب شان فارسی زبان بودند. پس به جرأت می توان گفت که فارسی در گسترش اسلام در شبه قاره نقش اساسی ایفا کرد، و می شود ادعا کرد که مردم شبه قاره توسّط فارسی با دین اسلام آشنا شدند، و

اگر عارفان فارسی زبان وارد شبه قاره نمی شدند، مشعل های دین مبین در تیرگی کفر افروخته نمی شد، و در ۱۹۴۷م کشوری به نام جمهوری اسلامی پاکستان به وجود نمی آمد.

در نیمهٔ قرن پنجم هجری قمری، اندکی پس از تهاجم های سلطان محمود غزنوی (درگذشت: ۴۲۱ ه ق)، سیّد علی بن عثمان هجویری (درگذشت: ۴۶۵ ه ق) که به لقب "داتا گنج بخش" خوانده و شناخته می شود، در لاهور حضور پیدا کرد و این شهر را مرکز و مستقر خود قرار داده ارزانی فیوض و برکات را ادامه داد. سیّد علی هجویری از شهر غزنین و فارسی زبان بود. لاهور چنین افتخار دارد که علی هجویری نخستین کتاب عرفان و تصوّف به زبان فارسی را به نام "کشف المحجوب" در همین شهر به سلک نگارش در آورد که امروز نیز، حتی بعد از هزار سال، مهمترین منبع و مرجع عرفان اسلامی و تصوّف ایرانی به شمار می آید.(هجویری، علی بن عثمان، به اهتمام محمود عابدی، ۱۳۸۳ش)

دارا شکوه (۱۰۲۴ الی ۱۰۶۹ ه ق)، شاهزادهٔ تیموری و فرزند شاهجهان، در سکینة الاولیا می نویسد که اگر کسی را صحبت مرشد معنوی یا شیخ طریقت میسّر نیاید، مطالعهٔ کشف المحجوب برایش کفایت می کند.

از اوایل قرن پنجم هجری، شبه قاره بویژه منطقه ای که امروز پاکستان نامیده می شود، مهد اصلی زبان و ادب فارسی گشت. در دوران غزنوی (قرن پنجم هجری) صاحبان قلم توسّط فارسی عواطف و احساسات درونی خود را ابراز می کردند، و در دوران بعدی این سنّت ادامه پیدا کرد. ابو عبدالله النکتی نخستین شاعر بومی فارسی بود.(صفا، ذبیح الله، پیشین، ص ۶۰۰)

بلوچستان، ایالت پهناور پاکستان، افتخار دارد که رابعه بنت کعب قزداری، نخستین شاعرهٔ تاریخ ادب فارسی، متعلّق به قزدار، یکی از شهرستان های این ایالت بود.(پیشین، ص۴۴۹) در دورهٔ غزنوی شاعران بزرگی مانند مسعود سعد سلمان

(۴۳۸ الی ۵۱۵ ه ق) و ابوالفرج رونی (درگذشت: ۴۸۴ ه ق) اشعار نغزی سرودند.(ریپکا، یان، ترجمهٔ کیخسرو کشاورزی، ۱۳۷۰ش، صص ۳۰۱ الی ۳۰۳)

هفت قرن آینده برای گسترش و ترویج شعر و ادب فارسی در شبه قاره بسیار ثمربار و فوق العاده مهم بود. فارسی نه تنها به عنوان زبان درباری و رسمی بلکه شناخت فرهنگ ایرانی و تمدّن اسلامی جایگاه ویژه ای یافت.(نفیسی، سعید، ۱۳۴۴ش) تا حدّی که مسلمانان همراه با زبان شیرین فارسی، فرهنگ پُربار و غنی ایرانی را نیز با قلب باز پذیرفتند، و براستی مسلمانان شبه قاره شیفته و وارفته ومسحور و مغلوب فارسی گشتند. جالب است که ایشان همان دینی را پذیرفتند که صوفیان و عارفان فارسی زبان با همراهشان آورده بودند، و همان فرهنگ را ورزیدند که در کنار فارسی و دین اسلام وارد این منطقه شده بود.(شیمل، آنه ماری، ترجمهٔ یعقوب آژند، ۱۳۷۳ش)

پس از فروپاشی امپراتوری غزنویان نیز از اهمیّت فارسی هیچ کاسته نشد.(اکرام، شیخ محمد، ۱۹۸۲م) در دورهٔ سلاطین سخنوران بزرگی مانند امیر خسرو دهلوی (۶۵۱ الی ۷۲۵ ه ق)، حسن سجزی (۶۵۲ الی ۷۰۷ ه ق)، ضیا الدین نخشبی (درگذشت: ۷۵۱ ه ق)، بدر چاچ (درگذشت: ۷۴۸ ه ق) و بو علی قلندر (درگذشت: ۷۲۳ ه ق)مشعل فروزان ادب فارسی را نورافشان نگه داشتند. در دوران خلجی (۶۸۹ الی ۷۲۰ ه ق) و سپس در دورهٔ تغلق، سادات و لودیان (پایان دوره: ۹۳۲ ه ق) نفوذ و رشد فارسی ادامه یافت، امّا کمالی که در دوران باشکوه تیموریان هندی (۹۳۲ ه ق/۱۵۲۶م الی ۱۸۵۷م) نصیب زبان و ادب فارسی شد،بدون هیچ شک و تردیدبیمانند و بینظیر است. وطن اصلی ظهیر الدین بابر (دوران حکومت: ۹۳۲ الی ۹۳۷ ه ق)، بنیان گذار امپراتوری تیموریان هندی در شبه قاره، فرغانه (ازبکستان فعلی) بود. امّا با وجود این، در دوران تیموریان فارسی جایگاه زبان رسمی و درباری را حفظ کرد، و پادشاهان تیموری در سرپرستی و تشویق شعر و سخن از

پادشاهان معاصر صفوی جلوتر رفتند، و هزاران هزار ارباب قلم ، اهل دانش و حکمت، سخنوران و سخن سنجان و شاعران و نویسندگان از ایران به شبه قاره مهاجرت نمودند. فهرست چنین شاعران و ادیبان بسیار طولانی است که استاد گلچین معانی در کتاب مبسوط و پُرارزش خود به نام "کاروان هند" به ذکر آنها پرداخته است.(گلچین معانی، ۱۳۷۳ش)

نصیرالدین همایون بنا بر عقب نشینی در برابر شیر شاه سوری برای مدّتی به عنوان مهمان شاه طهماسب صفوی در ایران بسربرد. گمان می رود که به دلیل آن مسافرت نفوذ ایرانیان در دربار تیموریان چندین برابر شد، و عدّهٔ زیادی از هنرمندان، معماران، نقّاشان، شاعران و ادیبان برای کسب معاش و در جستجوی فرصتهای مناسب اقتصادی وارد شبه قاره شدند، و پادشاهان تیموری نیز مقدم ایشان را گرامی داشتند و ازآنها پذیرایی گرم به عمل آمد.

پس از نصیرالدین همایون (درگذشت: ۹۶۴ ه ق)، بالتّرتیب در ادوار جلال الدین محمد اکبر (دوران حکومت: ۹۶۴ الی ۱۰۱۴ ه ق)، نورالدین محمد جهانگیر (دوران حکومت: ۱۰۱۴ الی ۱۰۳۷ ه ق) و شاه جهان (دوران حکومت: ۱۰۳۷ الی ۱۰۶۸ ه ق) زبان و ادب فارسی و هنرمندان ایرانی از اهمیّت ویژه ای برخوردار شدند. در این دوران فارسی نه تنها جایگاه زبان رسمی و درباری داشت بلکه زبان طبقهٔ اشرافیه نیز بود، و خانواده های باسواد به این زبان تکلّم و به آن افتخار می کردند.

همین زمان بود که مهرالنّسا معروف به نورجهان،ملکهٔ جهانگیر؛ و ارجمند بانو معروف به ممتاز محل، ملکهٔ شاهجهان؛ در ریشه گیری تمدّن ایرانی نقش اساسی ایفا نمودند. افزون بر آن دانشمندان ایرانی بر منصب وزارت نایل آمدند، فرهنگ ناب ایرانی در این خاک ریشه گرفت و تمدّن پالودهٔ اسلامی در خمیرمایهٔ شبه قاره شامل شد. در دوران وزارت مرزا غیاث بیگ اعتمادالدوله، پدر ملکه نور جهان؛ و آصف جاه، برادر ملکه نور جهان و پدر ملکه ممتاز محل؛ برای گسترش و توسعهٔ

فارسی و تشویق از دانشمندان ایرانی اقدامات شایانی به عمل آمد؛ و فرهنگ ایرانی، تمدّن هندی را تحت الشّعاع قرار داد.

در این دوران سخنوران نامدارانی همچون غزالی مشهدی (درگذشت: ۹۸۰ه ق)، عرفی شیرازی (۹۶۳ الی ۹۹۹ ه ق)، نظیری نیشاپوری (درگذشت: ۱۰۲۱ ه ق)، ظهوری ترشیزی (درگذشت: ۱۰۲۴ ه ق)، طالب آملی (درگذشت: ۱۰۳۶ ه ق)، ابو طالب کلیم کاشانی (درگذشت: ۱۰۶۱ ه ق)، قدسی مشهدی (درگذشت: ۱۰۶۷ ه ق)، صایب تبریزی (درگذشت: ۱۰۸۸ ه ق) و غیرهم به شبه قاره آمدند و جادوی زبان فارسی نه تنها مسلمانان بلکه هندوان وسیک ها را نیز مسحور ساخت، و آنها برای کسب معاش و جایگاه مهمی در جامعه به یادگیری و آموزش فارسی پرداختند. در این زمینه کتابی به نام "سهم هندوان در ادب فارسی"، پژوهش پُرارزش شاد روان استاد دکتر سیّد عبدالله اهمیّت ویژه ای دارد.

مروری بر تاریخ بیش از هزار سالهٔ فارسی در شبه قاره نشان می دهد که عروج و زوال اسلام و فارسی در این منطقه به همدیگر مربوط و مشروط است. در زمانی که اسلامیان روی کار بودند و قدرت و زمام اقتدار در دست ایشان بود، فارسی نیز رونق بیمانند و رواج باورنکردنی داشت، امّا به گفتهٔ خود فارسی زبانان "هر عروجی را زوالی"، هنگامی که مسلمانان دچار زوال شده زیر استیلای انگلیسیها قرار گرفتند، کم کم از اهمیّت دیرینهٔ فارسی کاسته شد و زبان انگلیسی جایگاهش را به خود اختصاص داد، و سرانجام در ۱۸۵۷م دوران تیموریان به پایان رسید.

در این زمان اردو، بنا بر بسامد واژگان فارسی، در میان مسلمانان؛ و هندی بنا بر بسامد لغات سانسکریت، در میان هندوها رونق گرفت. عدّه خانواده هایی که به فارسی تکلّم می کردند، یواش یواش کاهش یافت. متأسّفانه اسلامیان نه تنها از فارسی فاصله گرفتند بلکه بنا بر از دست دادن قدرت و ثروت، عشق و علاقهٔ دانش آموزی نیز در جامعهٔ آنها کمتر شد، و در نتیجهٔ بیسوادی و دوری از دانش و بینش و افزون بر آن

علوم دینی و دنیوی، فقر فرهنگی نصیب شان گردید. در چنین اوضاع وخیم خداوند متعال مسؤلیت روشن نگهداشتن شمع فارسی را به اقبال لاهوری (۱۸۷۷ الی ۱۹۳۸م) سپرد. در چنین دورهٔ تیرهٔ تاریخ اسلام این مرد دانا برای بیداری سراسر جهان اسلام فوق العاده تلاش کرد. اقبال در حدود پانزده هزار بیت سرود، و جای شگفتی است که این شاعر و فیلسوف که هیچگاه به ایران مسافرت نکرد و از هیچکس بطور رسمی فارسی نیاموخت، بیش از نه هزار بیت به فارسی سروده است(اقبال، کلیات فارسی، ۱۹۹۰م)، که براستی کمتر از معجزه نیست. دیوان اشعار اردوی وی مشتمل بر شش هزار بیت است.(اقبال، کلیات اردو، ۱۹۹۰م) بر اساس رهنمود های اقبال و فرهنگ اصیل اسلامی که صوفیان و عارفان فارسی زبان به نیاگان ما عطا کرده بودند، محمد علی جناح، رهبر کبیر مسلمانان شبه قاره، در ۱۹۴۷م، کشور جمهوری اسلامی پاکستان را بنیان گذاشت.

ما همه می دانیم که پاکستان نخستین کشور جهان است که بر اساس یک عقیده و ایدیولوژی روی نقشهٔ جهان پدیدار گشت، و این واقعیت هم از هیچکس پنهان نیست که عقیده ها در خاک ریشه نمی گیرد، اینکه در قلوب و اذهان به وجود می آید، با آب عاطفه و احساس آبیاری می شود، با دانش و بینش می بالد، و با ایثار و قربانی رشد می یابد. پس در این شکی نیست که برای بقا و احیای نظریهٔ پاکستان لازم است برای زنده نگهداشتن پیوند ناگسستنی با میراث نیاگان و بزرگان، بویژه در اندیشه های نژاد جوان دایم کوشا باشیم، و هیچگاه فراموش نکنیم که چنین مللی که ریشه های خود را از خاک گذشته می گسلند، حق زنده ماندن را از دست می دهند، و نهالی یا درختی که ریشه هایش کنده شود، تا دیر زنده و سبز و شاداب نمی ماند، روی شاخه های بریده، برگها نمی روید و گلها نمی شکوبد. چشم پوشی و صرف نظر از چنین واقعیّتها ما را در چاهِ ژرفِ زوال می اندازد.

امّا چطور می توان پیوند با گذشته و بستگی با میراث فرهنگی زنده

نگهداشت؟! پاسخ این پُرسش هم سهل است و هم دشوار. آسان به این جهت که فرهنگ و تمدّن، و دین و مذهب را زنده نگهداشته باشیم، و این امر تنها با احیای فرهنگ و زبان فارسی امکان پذیر است. مشکل به این سبب که متأسّفانه ما از حرلت و عمل دُور و از تلاش وجستجو بیگانه ایم. رژیم صیهونیستی را ببینید، آنها نیز ادعای مملکت ایدیولوژیک را دارند، و برای احیای زبان مرده و فراموش شده، تلاشهایشان دارد به ثمر می رسد، و زبان عبرانی الآن در تمام دانشگاههای معتبر و مهم اروپا و آمریکا تدریس می شود، در حالیکه فارسی زبانی است زنده و پوینده که میلیونها نفر بدان تکلّم می کنند.

پس از استقلال پاکستان، به دستور قایداعظم محمد علی جناح، رهبر کبیر ما، اردو به عنوان زبان ملّی تصویب شد، امّا حتٰی پس از گذشت بیش از شش دهه، هنوز نتوانسته ایم اردو را به جای انگلیسی به عنوان زبان رسمی جایگزین کنیم. در قانون اساسی ۱۹۷۳ م به ملّت نجیب و شریف ما قول داده شد که در ظرف فقط ده سال، اردو جایگزین انگلیسی خواهد شد، امّا جای بسیار تأسّف است که با گذشت هر سال ارزش و اهمیّت اردو کمتر می شود. واقعیّت تلخ همین است که امروز جایگاه اردو پایینتر از هر دوران پیشین تاریخ شصت و دو سالهٔ ماست. جای تأسّف و تحسّر و مایهٔ شگفتی است که اندیشمندان دلسوز روی صفحهٔ تلویزیون در مورد جایگاه و اهمیّت اردو به زبان انگلیسی اظهار نظر می فرمایند، و اگر اشتباهاً آمادهٔ صحبت به اردو شوند، به چنین اردوی انگلیسی آمیز تکلّم می کنند که درک آن برای یک آدم اردو زبانِ کم سواد امکان پذیر نمی ماند، و ما را به یاد "فارسی شکر است"، اثر جاودانی محمد علی جمالزاده، می اندازد.

بر همه روشن است که هیچکس تا موقعی که با فارسی آشنا نباشد، هرگز نمی تواند به اردوی صریح تکلّم کند، بنویسد یا متوجّه شود. بیجا نیست که اردو را دخترِ شیرین و نازنینِ فارسی نامیده اند، چون در ساختار اردو بیش از شصت در صد

لغات و اصطلاحات و تراکیب از فراسی گرفته شده است. ساختمان ادب اردو بر اساس ادب فارسی استوار است و هیچ جملهٔ اردو بدون اسفتاده از کلمات فارسی تکمیل نمی شود. فارسی تا هفت قرن زبان رسمی این مرز و بوم و زبان نیاگان ما بوده و گسلیدن پیوند با میراث اجداد فاصله گرفتن از گذشتهٔ تابناک خویش است.

قبلاً هم اشاره ای شد که اقبال لاهوری نگهدار تاریخ فرهنگی و بیانگر آیندهٔ روشن ماست. شعر درخشانش جادهٔ تیرهٔ آینده را به ما نشان می دهد. به عقیدهٔ خود اقبال "تاریخ چراغی است که جادهٔ آینده را برای ما منوّر می سازد". تفهیم کلام اقبال در واقع درک ایدیولوژی پاکستان است. عشق با شعر اقبال گویا عشق با بیداری، و عقیدت با اقبال گویا عقیدت با فرهنگ و تمدّن خویش است. باید در خاطرهٔ مان باشد که آموزش فارسی راهی است که به آرمانهای اقبال راهنمایی می کند.

براستی قرن بیست و یکم را عصر رأیانه و فناوری می نامند، امّا آیا می توان تاریخ، فرهنگ، تمدّن، اخلاق سازی، مردم سالاری و آدمیّت را از خاطر زدود؟! همه قبول دارند که جامعهٔ ما در آستانهٔ فروپاشی معنوی است، امّا چاره جویی را به چه کسی بسپاریم؟ ملّت ما برای آینده چه هدفی را در پیش دارد؟

حقایق یاد شده را در نظر داشته نکات برجستهٔ زیر در مورد ارزش و اهمیّت فارسی پیش می آید. باید فارسی را اهمیّت بدهیم، برای:

برقراری پیوند با گذشته؛

نگهداری میراث نیاگان؛

بقای تمدّن و فرهنگ اسلامی؛

نگهداشت شناخت فرهنگی؛

تفهیم نظریهٔ پاکستان؛

به وجود آوردن عاطفهٔ میهن دوستی بویژه در نژاد نو، و جوانان امروز؛

احیای اقدار اخلاقی؛

یاد گرفتن زبان ملّی مان یعنی اردو؛

ترویج اصطلاحات علمی پژوهشی در زبان اردو؛

غنی سازی زبان اردو؛

مقاومت در برابر تهاجم فرهنگی اروپا و آمریکا؛

توسعه و گسترش فرهنگ اصیل اسلامی و شرقی؛

تفهیم مبانی دین مبین اسلام و ادراک شروح قرآنی و کتب عرفانی؛

رشد و گسترش بیشتر روابط دوستانه با کشورهای همسایه و هم سرنوشت و برادر اسلامی از جمله جمهوری اسلامی ایران و افغانستان؛

تحکیم پیوند صمیمانه با کشورهای آسیای میانه، بویژه کشور فارسی زبان جمهوری تاجیکستان؛

آشنایی با زبان نازنین اردو، دختر شیرین فارسی و زبان ملّی پاکستان؛

تشکیل محیط اسلامی، فرهنگی و ادبی؛

تفهیم کلام اقبال، متفکّر بزرگ مشرق زمین و شاعر ملّی و مصوّر پاکستان؛

درک اندیشهٔ اقبال و تفهیم اسباب و علل تأسیس و استقلال پاکستان؛

حفظ و بقای هویت و تشخّص پاکستان.

پس به جرأت می توان ادعا کرد که آیندهٔ فارسی و پاکستان بستگی به همدیگر دارد و درک این واقعیّت آیندهٔ ما را تعیین می کند.

☆☆☆

منابع:

. ابوالقاسمی، محسن؛ ۱۳۷۳ش، تاریخ زبان فارسی، انتشارات سازمان مطالعه و تدوین کتب علوم انسانی، تهران.

. اقبال لاهوری؛ ۱۹۹۰م، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاهور.

.اقبال لاهوری؛ ۱۹۹۰م، کلیات اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاهور.

.اکرم، شیخ محمد؛ ۱۹۸۲م، آب کوثر، مجلس ترقّی ادب، لاهور.

.اکرم، شیخ محمد؛ ۱۹۸۲م، رود کوثر، مجلس ترقّی ادب، لاهور.

.اکرم، شیخ محمد؛ ۱۹۸۲م، موج کوثر، مجلس ترقّی ادب، لاهور.

.دارا شکوه؛ ۱۹۸۵م، سکینة الاولیا، لاهور.

.رازی، عبدالله؛ ۱۳۷۲ش، تاریخ کامل ایران، انتشارات اقبال، تهران.

.ریپکا، یان؛ ۱۳۷۰ش، تاریخ ادبیات ایران، ترجمهٔ کیخسرو کشاورزی، انتشارات گوتمبرگ و جاویدان خرد، تهران.

.سیّد عبدالله؛ فارسی ادب میں هندوؤں کا حصه، لاهور.

.شفق، رضا زاده؛ ۱۳۵۷ش، تاریخ ادبیات ایران، تهران.

. شیمل، آنه ماری؛ ۱۳۷۳ش، ادبیات اسلامی هند، ترجمهٔ یعقوب آژند، انتشارات امیر کبیر، تهران.

. صفا، ذبیح الله؛ ۱۳۷۳ش، تاریخ ادبیات در ایران، پنج جلد، چاپ یازدهم، انتشارات فردوس، تهران.

. گلچین معانی؛ ۱۳۷۳ش، کاروان هند، انتشارات آستان قدس رضوی، تهران.

. معین، محمد؛ ۱۳۷۵ش، فرهنگ فارسی، جلد پنجم و ششم، انتشارات امیر کبیر، تهران.

. نفیسی، سعید؛ ۱۳۴۴ش، تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی، کتاب فروشی فروغی، تهران.

. هجویری، علی بن عثمان؛ ۱۳۸۳ش، کشف المحجوب، به اهتمام محمود عابدی، انتشارات سروش، تهران.

. یمین خان؛ ۱۹۷۱م، تاریخ شعر و سخنوران فارسی در لاهور، لاهور.

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولایی ۔ ستمبر،
شمارہ۷۶، ۲۰۰۹ء

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 119 – 136

منشی خیالی رام و روشهای حاشیه نگاری او بر کتاب اعجاز خسروی امیر خسرو دهلوی

مصباح الدین نرزیقول محمود زاده [1]

Abstract:

Persian has been the court language of sub-continent throughout the Muslim period. Thousand of books over written and millions of verses were sung in this sweet language. Amir Khusraw is reckoned one of the most celebrated poets in literary history of sub-continent. He was not only a prominent poet but at the same time was a great prose writer as well. He has written many valuable books. Ejaz-e-Khusrawi is considered one of the important books left by him. In this article, the references written by Munshi Khayali Ram have been evaluated.

Keywords: Amir Khusarw,Ejaz -e-Khusarwi,Khayali Ram unshiM

به نسخهٔ چاپ سنگی کتاب اعجاز خسروی که در لکهنو کشور هند صورت گرفته و یگانه نسخهٔ چاپی دسترس از این کتاب می باشد، حاشیهٔ مفصلی نگاشته شده است. این حاشیه تا اندازه ای در معرفت درست کتاب خدمت می نماید. از این رو، در این مقاله، با توجه به کار انجام دادهٔ حاشیه نویس که اسم مبارک او در کتاب قید

---

[1] دانشگاه ملی تاجیکستان

نگردیده است، از روی چند دلیل دست رس به شخصیت حاشیه نگار، قدر زحمت وی و مسأله های معرفت کلام فارسی در شبه قارهٔ هند می پردازیم.

حاشیه نویسی یکی از معمول ترین شغل های ادبی در عصرهای میانه بوده، اگرچه از نگاه ماهیت به جریان شرح نگاری ارتباط دارد، از نگاه طریق نگارش و شیوهٔ کار بین آنها فرق های نظر رسی موجودند که در مثال حاشیهٔ کتاب اعجاز خسروی امیر خسرو دهلوی برملا نمودار می گردند. اگر به سابقهٔ تدقیق در این مسأله توجه بشود، معلوم می شود که جریان شرح نگاری- بخصوص شرح آثار بدیعی- در ادبیات شناسی تاجیک مورد توجه دانش مندان قرار گرفته است. در این باره دانش مند توانای تاجیک استاد عبد المنان نصرالدین تدقیقات انجام داده و پیرامون مباحث شرح آثار ادبی کتابهای ارزشمند «نویسنده و شاریح آثار ادبی» (نصر الدین اف 1990)، «معرفت و شرح ادبیات» (نصر الدین اف 1991) و در دو جلد کتاب «شرح نویسی در تاریخ ادب فارس-تاجیک» (نصر الدین 2000 ؛ (نصر الدین 2001) را تعلیف نموده است. اما در مسألهٔ حاشیه نویسی همچون شاخهٔ جداگانهٔ معرفت ادبی، اگرچه در زمینهٔ بررسی مسأله های معرفت کلام اشاره ها جای دارند، هنوز تدقیق جداگانهٔ فراگر به میان نیامده است. انجام این کار باید از جملهٔ وظیفه های اولین درجهٔ ادبیات شناسی معاصر قرار بگرد.

نگارندهٔ سطور هنگام بررسی مسألهٔ شرح نگاری همچون رویهٔ معمول علمی در عصرهای XIII-XIV که این دوره به زمان زندگی امیر خسرو نیز راست می آید، جریان شرح نگاری را در آن زمان و به صورت جامع در ادبیات شناسی عصرهای میانه به سه رویه طبقه بندی نموده بود: الف) تفسیر، تأویل و تنزیل قرآن، ب) شرح نگار به آثار بدیعی و پ) شرح آثار علمی. چنانچه این سه رویه را به حاشیه نویسی تطبیق نما ایم کار حاشیه نویسی به اثر امیر خسرو را حاشیه نویسی به آثار علمی می نامیم.

در مورد نام و نصب شارح اثر امیر خسرو در متن حاشیه ای معلومات دست رس نگردید. در خلال حاشیه نگاشته ها همین قدر معلوم می گردد که وی شاگرد مولوی احسان الله خان ممتاز بوده و به استاد خویش به درجه ای عنایت تام

داشته است که رأی او را از همه برتر می دانسته است. چنانچه، ضمن توضیح لفظ «کبریا» بنابر رعایهٔ صنعت ترصیع، به قول استادش به صورت ذیل تکیه کرده است: «در بیشتر نسخ به جای «عظمت» لفظ «کبریا» مشتهر و از کبریا صنعت ترصیع هویدا نمی گردد. استاد بنده ممتاز الشعرا مولوی احسان الله خان ممتاز لفظ عظوت فرموده (که) صنعت ترصیع قائم ماند» (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 5). همچنین، در آخر صفحهٔ مورد نظر، بیانش را مستفاد از استادش دانسته است. این تأکید دال بر این معنی است که شارح در ابراز نظر خویش خودخواه نیست، بلکه از اندیشه های استادش نیز سود جسته است.

مولوی احسن الله خان ممتاز شاعر هم بوده است. در مورد شرح واژهٔ «رقیب» همچون شاهد معنای بیت زیرین او نقل شده است:

رقیب روسیه در دستم افتادست و دل شادم

که از بهر بلاگردانش زاغی کرده ام پیدا.

(خسرو 1872، رسالهٔ دوم، 213)

بیت زیرین نیز از همین شاعر است:

چه نطق و لب، چه رنگ و بو، چه جسم است؟

ز کیف خوبی اش هر پنج حس مست!

(خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 116)

شخصیت حاشیه نویس را با توجه به مطالب تقریظی که در آخر نسخهٔ چاپ لکهنوی کتاب جای دارد، معین کردن ممکن است. تقریض مزکور به زبان اردو و به قلم منشی غلام محمد خان نوشته شده است. به مقصد دست رسی اهل تدقیق به این تقریظ، متن کامل آن را در شکل ترجمه که با یاردم برادر ارجمند دکتر محمد ناصر پاکستانی به دست آمده است، نقل نموده و ثانی به اصل مقصد برمی گردیم. اقتباسات داخل تقریظ در صورت اصل، یعنی به زبان فارسی آمده اند:

تقریظ ریختهٔ قلم جادو رقم منشی غلام محمد خان، مدیر مسول روزنامهٔ اوده، لکهنو

شعر: خذ ما کتبت بجدٍ لو ترید ثری   سحراً حلالاً علی القرطاس بالقلم.

[اکر ثروت و توانگری می خواهی، با تلاش فراوان بگر آن چه نوشته ام، - از (شعری)، که مانند جادوای درست است، بر کاغذ و قلم.]

اعجاز خسروی از نوشته های برگزیدهٔ حضرت امیر خسرو دهلوی است. این کتابی است که از اسلاف تا امروز دانش مندان و ادیبان نتوانسته اند، به چنین فصاحت و بلاغت نوشته ای را پدید آورند. در این کتاب در بارهٔ هنر انشانویسی، صناعات ادبی، لطائف و ظرائف، دقائق و حقائق، نکات و معانی به حدی بیان شده اند که گویا نویسنده اختراعات و ایجادات گوناگون کلمات و معانی را جمع آوری کرده است. حق این است که خداوند متعال از ازل این گنجینهٔ معانی را برای امیر خسرو مخصوص کرده بود. فقط برای وی در عرش معانی قفل بود. دری که این فخر المتقدمین و امام المصنفین با کلید زبان درفشان خود باز کرد و فرصتی برای ما پیدا کرد که از آن استفاده کنیم. حقیقت این است که مانند «احیاءالعلوم» حضرت امام غزالی، «مسنوی معنوی» مولوی، امرالقیس از فصحای عرب، «سبعهٔ معلقه»، «سکندر نامه» نظامی، «گلستان» و «بوستان» سعدی، اعجاز خسروی حضرت امیر خسرو نیز کتابی است بسیار معروف و یادگار که چنین نوشته ای به دنیا نیامده و نخواهد آمد. هر که به هنر انشا نمویسی ذوق و علاقه داشته باشد، می تواند از این کتاب بسیار فوق العاده استفاده بکند. با مطالعهٔ این کتاب، نه تنها می توان دبیر بی مانند فارسی شد، بلکه استعداد در علم و ادب عربی را نیز افزود. زیرا ابیات عربی نیز با نظم و نثر فارسی نقل شده اند و زبان عربی خسرو کمتر از اهل زبان نیست، بلکه محاسن شعری و ویژگی های بیان از خود اهل زبانها برتر است. جالب این است که یک ادیب و فاضل و انشاپرداز بزرگ نیز مانند یک دانش جوی عادی می تواند از این کتاب استفاده کند.

اگر حاشیهٔ این کتاب نوشته نمی شد و شرح و حل لغات و ترجمهٔ ابیات عربی آورده نمی شد، شاید از هزاران هزار نفر کسی نمی توانست، مفهوم اصلی را درک کند. کسانی که ادعای معنی فهمی و انشا پردازی را دارند و خود را عالم و فاضل و همه دان می پندارند، اگر این کتاب را ملاحظه بکنند، اعتقاد بنده این است که جهالت آنان بر خود ایشان روشن می گردد. حضرت امیر چه کتابی نوشته، چه کلماتی

را آورده و چه جمله های را ساخته که هر کلمهٔ وی دارای معانی بسیار و بیان گر هنر صنایع و بدایع است. این کتاب در دورهٔ علاءالدین غری، پادشاه دهلی نوشته شد، پس در مدح آن پادشاه نیز صنعت گری دیده می شود.

اعجاز خسروی مشتمل بر پنج رساله است که هر یک بی مانند و بی نظیر است. نویسنده در آغاز کتاب رسائل الاعجاز فرموده است: «به فضل منشی بدائع آغاز کردم ترتیب این ترسل به طراوتی که سیلاب لطافتش قلم عطارد را پای راست ستادن ندهد و موج لطائفش برجیس را آب از سر بکزراند. از صحایف این جریده مکتوباتی در یمن کرام کتاب آید که کراماً کاتبین را یمین تعظیم به ذیل عزت آن باشد و از نوردهای این برنیان رقعها در آستین فضلاء انس و جان افتد که روح الامین بیوند جانش سازد و خضر که پیش از این به چندین هزار سال آب در سیاهی انداخت همانا انتساخ این نسخه را انتظار می کرد و عیسی که چندین دور در بیت معمور معتکف گشت مگر قرأت این کتاب را ترصد می نمود. هم در دیوان ازل که این دفتر به تحریر پیوست قلم قضا بیاسود و تا ابد که روز و شب نباشد این سواد و بیاض خواهد بود. نظم:

کراز جهان برود روز و شب مترسی زانکه
مقام هر دو نگه دارد این بیاض و سواد.

پنهان نماند که نویسنده مانند کتابهای نویسندگان بی نظیر و دبیران مشاهیر کتاب خود را در ابواب و فصول تقسیم و مرتب کرده است. فهرست کامل رساله ها به این ترتیب است: **الرسالة الاولی** فی المفردات و المرکبات، یعنی رسالهٔ اول در بیان مفردات و مرکبات و شامل ده خط است؛ **الرسالة الثانیة** فی المرتبات من المکتوبات علی عشرة خطوط (در این رساله ترتیب مکتوبات بیان شده است). **الرسالة الثالثة** فی اللطایف من المصنوعات تشتمل علی خطین، یعنی در رسالهٔ سوم لطایف و صناعات عبارات و انشا در دو خط ذکر شده است. **الرسالة الرابعة** فی البدایع من المعنویات تشتمل علی خمسة خطوط، یعنی چهارمین رساله در بیان بدتیع معنوی است، در پنج خط. **الرسالة الخامسة** فی السوابق من المنشآت تشتمل علی ستته خطوط. در رسالهٔ پنجم روش قدمی انشا نگاری ذکر شده و شامل شش فصل است.

خط اول (منظور رسالهٔ اول – م.ن.) در کیفیتی چند مختلف که نمودار آن ضروریست، مشتمل بر هفت حرف، **خط دوم** در مفردات، مشتمل بر پنج حرف. **خط سوم** در لطائف الفاظ نحو و تصریف و ادوات و حروف تحجی و آنچه بدین مناسب است و نمودار انکیخت در اینها، مشتمل بر هشت حرف. **خط چهارم** در نوادری که از الفاظ و اصطلاحات علوم خیزد، مشتمل بر چهار حرف. **خط پنجم** در الفاظ مصطلح ترسلات قدیم و نمودار استعمال به رسم جدید، مشتمل بر نه حروف. **خط ششم** در مناسبت ترکیب الفاظ و القاب و اسامی و کتابتی که از اول نامه تا آغاز غرض آید، مشتمل بر سه حرف. **خط هفتم** در آغاز مضمونات و اغراض مکتوبات، مشتمل بر شش حرف. **خط هشتم** در ادعیه قدیم و جدید بر بست حکایت، مشتمل بر سه حرف. **خط نهم** در تاریخ، مشتمل بر هفت حرف. **خط دهم** در شرائط نسبت، مشتمل بر هشت حرف. قطعه:

هر آنچه اندر دو حرف کن معانی است از این ده خط توانی کرد معلوم
بماند این رقم چون نقش بر سنک که بنشیند به دل چون نقش در موم.

خط اول (منظور رسالهٔ اول، بعد از آن حرفهای همین خط می آید – م.ن.) در کیفیتی چند مختلف که نمودار آن ضروریست، مشتمل بر هفت حرف: **حرف اول** در ماجرای شرائع مترسلانه قدیم و روش جدید که از عین طبع متبحران هند موج زده. **حرف دوم** در باعثه ابداع طرز. **حرف سوم** در صفت طریقه بخته مترسلان و بیان خامه راندن جدید کاتب. **حرف چهارم** درگسستن حمائل تضمین از این مخدره و هم از سلک نظم ملکش سوار پوشانیدن. **حرف پنجم** در معزرت شعر عربی خویش. **حرف ششم** در ترک پیرایهای لفظی. **حرف هفتم** در التماس تصحیح و اتقان کتابت این کتاب. بیت:

این بیت که روحراست خانه هست از پی فرق در میانه.

این فهرست فقط نشان دهندهٔ ترتیب ظاهری کتاب است، اما تمام ویژگی های کتاب را با خواندن کامل آن می توان درک کرد. شخصیت حضرت امیر خسرو و این کتاب هر دو محتاج ستایش ظاهری نیستند و خوبی های این کتاب از اهل نظر پنهان نیست، بلکه فقط یک عالم و دانش مند ارزش این کتاب را می تواند بفهمد. بنده، نمی

خواهد صحبت را طول بدهد، اما شایان ذکر است که حضرت امیر عروس سخن را لباص رنگین و دل فریب پوشانیده و دل عاشقان معنی را ربوده است. زیبائی سخنان وی حوران بهشتی را مطیع خود می سازد.

دفتر اول این انشای معجز بیان با حواشی عالم بی مانند، مولوی غلام حسین کنتوری توسط همین چاپخانه به چاپ رسیده و در چند روز به فروش رفته است و مردم باز هم مشتاق آن کتاب هستند. مرحوم منشی خیالی رام تمام کتاب را طوری ترتیب داده که حواشی دفتر اول را مثل سابق آورده و اصطلاحات و حواشی را اضافه کرده است. منشی نولکشور، صاحب چاپخانهٔ روزنامهٔ **اوده** کتاب کامل را با حواشی کامل منشی خیالی رام در ماه اپریل (آوریل) 1876 میلادی، مصادف با ماه ربیع الاول 1293 هجری روی کاغذ درجهٔ یک به چاپ رسانیده است. این مادهٔ تاریخ (قطعه) در خصوص چاپ کتاب نتیجهٔ ذوق و استعداد نواب محمد احمد حسن خانصاحب، متخلص به جوش است:

طبع گردید چو این نسخهٔ نادر، ای جوش هاتف غیب بر افلاک به من داد آواز
فکر تاریخ ترا هست اگر مد نظر از پی سال بگو: باد چراغ اعجاز»

(خسرو 1876، رسالهٔ پنجم، 174-175).

برگردیم، به غرض اصلی امان. از پایان تقریظ معلوم می شود که مؤلف حاشیهٔ کامل رساله های پنج گانهٔ اعجاز خسروی منشی خیالی رام بوده و کتاب با حواشی او پس از مرگش از جانب منشی نولکشور به چاپ رسیده است. قبل از منشی خیالی رام به دفتر اول اثر مولوی غلام حسین کنتوری حاشیه نگاشته بوده است و کار وی در این طبع با علاوه و تکمل به هم آمده است.

منشی خیالی رام، ضمن کار خویش نسخ دگر اعجاز خسروی را هم پیش دست داشته است، چنکه چندین کرت در مورد شرح این یا آن واژه از نسخه های دیگر نیز یاد کرده است. از جمله، در موارد ذیل: الف) «وتر: به فتحتین زیه کمان و زیه هر چه باشد و در بعضی نسخ به جای وتر لفظ تیر هم دیده شد» (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 117)؛ ب) در جای دگر به طور مشخص از نسخهٔ مولوی عبدالواسع یاد

کرده است: «در نسخهٔ مولوی عبد الواسع همین یافته شد...» (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 117). از این نسخه موارد دیگری هم یاد شده است.

همین طور، هنگام شرح و معنی کردن کلمه ها، با توجه به نشان داد نسخه ها، اکثر شکل به نظر شارح صحیح نسخه بدل ها ذکر شده اند. از این جا می توان چنین نتیجه به دست آورد که کار حاشیه نویسی منشی خیالی رام بر اعجاز خسروی یک نوع، کار تصحیح متن در زمان او نیز می باشد.

حاشیهٔ مورد نظر به صورت کتاب جداگانه – چنانکه در عصر های میانه در مورد شرح و توضیح این یا آن اثر حاصل کار شارح با نام های گوناگون انتشار می یافت – تنظیم نشده است. بلکه نتیجهٔ کار او در حاشیهٔ هر یک صفحه نگاشته شده است و از روی آن روشهای کار شارح و مختصات نظر وی را استخراج و بررسی نمودن ممکن است. به طور ذیل:

1- معمولاً ترجمهٔ کلمه، ترکیب و ابیات عربی ذکر گردیده و گاهی پیرامون بعضی واژه های ترکیب کلام عربی، خصوصیات دستوری آنها مطرح می گردد. این روش حکم عمومی داشته و از آغاز تا آخر کتاب رعایت می شود.

ترجمهٔ آیات کلام ربانی آورده می شوند، اما در مورد منصوبیت آنها به سوره ها اشاره نمی شود. به احادث نبوی نیز اشاره و ترجمه آنها نوشته می شود.

2- در مورد شرح پهلو های معنای کلمه ها به نظر دانش مندان دیگر، از جمله اصحاب لغت عنایت فرموده و در آخر معنی مورد نظر یا خود معنی به مراد مؤلف موافق تاکید می گردد. مثلاً، ضمن شرح واژهٔ «کتاب» که در آغاز کتاب، در ترکیب عربی «هذ الکتاب...» مندرج است، چنین آمده است: «... و یکی از ارباب تحقیق، نوشته که کتاب، به کسر اول، از اوزان باب تفعیل است، به معنی نوشتن. پس، به معنی مکتوب مستعمل، بر این اعتبار که مصدر به معنی مفعول گفته می شود. در این جا مراد از معنی اول است» (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 2). مراد از «یکی از ارباب تحقیق» در این نقل قول اندیشهٔ مؤلف کتاب «غیاث اللغات» می باشد.

3- هنگام معنی کردن کلمه های جداگانه، طریق تلفظ درست کلمه و شرح معنائی آنها با توجه به یکی از کتاب های لغت معتبر ذکر می گردد. حاشیه نگار در

کار شرح و توضح کلمه و عبارات از فرهنگ و لغت نامه های که سود جسته است، گاهی با آوردن اسم پرهٔ کتاب و گاهی مختصر آن، به طور زیرین یاد کرده است: بهار عجم، کشف الغات، برهان، منتخب اللغات، صراح، غیاث اللغات، رشیدی، مدار، سراج الغات، چراغ هدایت، موند، لطائف، کنز، مذیل الاغلات، بهرالجواهر، لغت بابا، سروری، مصطلحان وارسته، زبدهٔ الفوائد، نصاب، فرهنگ عبدالرزاق، قاموس، جهان گری، حل اللغات، فرهنگ حسینی، صحاح، مرعات، جهان نما، زفان گویا.

به نظر می رسد که شارح، در این میان، بیشتر به قول صاحب «منتخب اللغات» عنایت فرموده است. چون به این لغت مراجعت کردیم، معلوم شد که چنین برخورد بی سبب نبوده است: «منتخب اللغات» منتخبی از کتاب های لغت معتبر، به مثل قاموس، صحاح و صراح بوده و چنان که در مقدمهٔ آن آمده است، «کتابی است در تحقیق بیان لغات ضروریهٔ کثیرالاستعمال که با زبان فارسی عامه فهم تنظیم گردیده است» (ططوی 1891، 8).

4- انتخاب کلمه های سیر معنا و کاربست آنها در میان ترکیب و جمله ها یکی از مختصات اساسی طریق بیان امیر خسرو محسوب می شود. از این جاست که شارح، ضمن شرح چنین کلمه ها نخست از روی فرهنگ و لغت نامه های معتبر پهلو های معنائی آنهارا یکایک برمی شمارد، ثانی معنی مناسب را تأکد می نماید. به مثل نمونهٔ زیر: «سواد: در صراح به معنی سیاهی و مال کثیر و دهات گرداگرد و دانهٔ سیاهی که در دل است و هر عددی که بسیار باشد، نوشته. و این جا به معنی گرداگرد مناسب است... (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 3).

حد اقل به دو و یا سه معنی و حد اکثر دلالت بر شانزده، بیست و هشت و از آن هم زیاد معنی داشتن کلمه برمی خوریم. مثلاً، در ذیل واژهٔ «بر» به بیست و هشت معنی دلالت کردن آن تأکد شده است (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 3). برای معنی مناسب، اکثر یک معنی نزدیک به مراد و گاهی دو معنی تأکد می شود.

بعضاً، با توجه به طریق هنری بیان و کلام صنعت گرایانهٔ امیر خسرو، صناعات بدیعی مندرج در فقره های جداگانه مشخص و یادرس می شوند. معمول ترین صناعات بدیعی ای که شارح - غیر از صناعات مندرج در رسالهٔ مصنوعات –

به آنها اشاره کرده است، اینها اند: اشتقاق، تشبیه، تجنیس و انواع آن، ضمن اللفظ، کنایه، ترجمان، متضادّ، ترسیع، ایهام، مبادلةالرأسین، قتع الرأس، قلب، تضادّ معنوی، معما.

چنانچه اسامی صناعات بدیعی در خلال متون درج شده باشند، در حاشیه همان اصطلاح از روی معنی لغوی و اصطلاحی توضیح می یابد.

7- در چند مورد به شمار، به کدام بحر متعلق بودن بیت و صورت تقتیعی آن به صورت خطی و گاهی تنها تقتیع بیت ذکر می گردد. به نظر ما، توجه به این منوال، به خاطر درست خواندن ابیات عربی است. حالاتی هم به مشاهده می رسند که شارح از روی تعیین وزن شعر به سحو کاتبان نیز اشاره می کند

(خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 11).

8- مناسبت بین واژه ها در فقره ها به گونهٔ خیلی زیاد تاکد می شود، به اندازه ای که در بعضی موارد نالازم می نماید.

9- تعبیر ها به صورت جامع توضیح یافته اند، به مثل نمونه های ذیل: سر مگس، یعنی اندکی؛ زبان داد: ظهور معانی، کمال معانی، زبان یافته، اقرار کرد؛ به کام رسانید: به مقصود فایض گردانید؛ صحیفهٔ غیب: مراد از لوح محفوظ، یعنی قرآن کریم.

10- توجه حاشیه نگار در معنی کردن بعضی کلمه ها به اندازه ای عمیق است که پهلوهای معنائی واژه ها را به سه زبان بیان می کند. مثلاً، به شرح معنائی لفظ «کلاب» توجه فرمائیم: «کلاب جمع «کلب» است. در عربی به معنی سگ باشد و در فارسی گرد بر گرد دهان و منقار مرغان و به ضم ثانی، هندویان یک شبانه روز برهمنی را گویند که آن هزار سال باشد» (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 16).

پس از چنین معنی کردن، خواننده باید سر معنی مورد نظر توجه بکند، تا دریابد که منظور نویسنده کدام معنی است. اکثر با توجه به هر سه پهلوی معنائی واژه به دست آوردن رشتهٔ اندیشه ممکن می نماید، اما در این صورت شرط اساسی آگاه بودن خواننده از طریق بیان و مختصات سبک نگارش نویسنده می باشد.

ضمناً، در معرفت طریق سخن خسروانه توجه به معنای ترکی بعضی واژه ها هم مهم است. از این جاست که در حاشیه به شرح ترکی چند کلمه نیز دچار می

شویم. از جمله: تیمور: در ترکی آهن را گویند؛ قیق: کوه محیط به دنیا، یعنی کوه قاف و به زبان ترکی، نعره به آواز بلند را گویند (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 16).

11- گاهی اوقاط، ذیل ترکیب «حاصل این فقره این است»، مطلب مصنف با جملهٔ نسبتاً ساده و فهماتر، یعنی بدون پیرایه های بیانی و بلاغی ارائه می گردد.

12- یکی از معمول ترین اصول شرح کلمه ها آوردن مرادف عربی آنها می باشد که این منوال اغلب در شرح کلمه و عباره و ترکیبات فارسی اصل استفاده شده است. در این خصوص باز توقف خواهد شد.

13- در شرح و معنی کردن کلمه ها همچون شاهد معنای از اشعار شاعران زیادی نمونه ها ذکر گردیده اند. موافق فهرست تهیه کردهٔ ما، شمارهٔ شاعرانی که از اشعار آنها شاهد معنای نقل شده است، به یک صد و شست و شش می رسد. به این شماره، اشعاری که بدون ذکر اسم گوینده با ترکیب «شاعری گوید» آمده اند، علاوه می گردند. در سه رسالهٔ آخر اعجاز خسروی هشتاد و شش مورد همچون شاهد معنای اشعار امیر خسرو نیز نقل شده است.

به نظر می نماید که حاشیه نگار، بعضاً برای زیبای ظاهری حاشیه، یعنی به خاطر پر کردن حاشیهٔ صحیفه ذیل یک کلمه از ایجادیات شاعران زیادی نمونه های شاهدی زیادی نقل می کند که به کلی در درک معنی همگون می باشند.

14- حاشیه نویس، نظر محققانه دارد، چنین صفت کار وی در شرح واژه های جداگانه به مشاهده می آید. همچنین، در لابه لای توضیحات معلوماتی نیز جای دارند که دلالت بر پهنای نظر تحقیقی و اهمیت سرچشمه ای کار او دارند. مثلاً، با توجه به معلومات فرهنگ نامه ها ضمن معنی کردن واژهٔ «رشته» به صورت ذیل شرح می دهد: «... و این که در هندوستان به معنی خویشی و قرابت مستعمل می شود، در فارسی دیده نشد...» (خسرو، رسالهٔ چهارم، 66). روش مزکور، بخصوص در مقائسهٔ واژه های که در هند هم رایج بوده اند، به نظر می رسد.

طریق دگر، چنین است که حاشیه نگار در توضیح کلمه های جداگانه از دائرهٔ معلومات کتب فرهنگ و لغت هم خارج می شود و با تکیه به سرچشمه های ادبی دیگر، کوشش جست و جوی صورت صحیح کلمه ها را می کند. چنین روش در

معرفت عمومی کلام امیر خسرو و دستیابی به پهلوهای معنائی واژه های سیرمعنی مساعدت می نماید. باری، به غیر از فرهنگ و لغت نامه ها، که سرچشمهٔ اصلی اند، از کتب و رسائل ذیل استفاده شده است: شرح نصاب الصبیان، مجمع الصنائع (از این کتاب در مورد شرح صنعت ایهام استفاده شده است)، تحفهٔ المؤمنین (در مورد شرح اصطلاحات دینی)، خیابان، رسالهٔ عروض، ترجمهٔ مقامات حریری، تشریح الحروف، شرح قران السعدین، شرح سکندر نامه (از خان آرزو)، رسالهٔ معربات، رسالهٔ نجوم، شرح قصائد عرفی، تذکرهٔ الاولیا.

15- در میان حاشیه نگاشته ها به تحقیق هم دچار می شویم. به این معنی که حاشیه نویس، در مورد شرح برخی کلمه ها از دائرهٔ معنی داد واژه ها فراتر گام نهاده و اکثر با توجه به منابع و گاهی بدون ذکر سرچشمه ای نتیجهٔ تدقیق خویش را منظور می گرداند. همچون مثال، می توان از اندیشه های در ذیل کلمه های «ذوالاکناف«، «اولیا» و «جم» ارائه گردیده اشاره کرد (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 17، 24، 31). برای نمونه تحقیق واژهٔ آخر را نقل می کنیم: «جم: اگر با خاتم و نگین و بلقس و ماهی و امثال آن مذکور بود، مهتر سلیمان مراد بود؛ و اگر به مقابلهٔ آئینه و صدّ و امثال آن افتد، سلطان سکندر مراد؛ و آن که پیاله و شراب در آن بیت مرقوم باشد، جمشید معین بود؛ چون از این چیزها چیزی مستور نبود، هرچه مقتضی محل باشد، همان مراد دارند».

چنین اندیشه ها که برای معرفت کامل واژه های مورد نظر بیان گردیده اند، ماهیت ادبی و معرفتی کار حاشیه نویس را دوچند گردانیده اند و با توجه به همین منوال کار او را تألیف علمی جداگانه حسابیدن غلط نیست. در این راستا، با حضف تکرار های موجود، دسته بندی مطالب و با نظام الفبای تهیه و به چاپ آماده کردن متن کامل حاشیهٔ اعجاز خسروی نیز به مقصد موافق می نماید.

حاشیهٔ اعجاز خسروی حاوی مجموع اطلاعات علمی و ادبی نیز می باشد. به این معنی که شارح ضمن شرح مطالب جداگانه بر آگاهی های ناکفایهٔ ما آگاهی می افزاید. مثلاً، در خلال حاشیه نگاشته ها از حاشیه ای آگاه می شویم که قبل از او کس دیگری بر کتاب مورد نظر نگاشته بوده است، به طور ذیل: «زر رشته...: به معنی

کلابتن در حاشیه نوشته، مگر در کتابی دیده نشد» (خسرو 1872، رسالۂ یکم، 12). به همین منوال از حاشیۂ کتاب در موارد دگر نیز یاد می شود (خسرو 1872، رسالۂ یکم، 15، 16، 18، 31...).

نظر حاشیه نگار به نسخ حاشیه های مورد نظر بسیار احترامانه و با حسن رعایۂ امانت صورت گرفته است. در بعضی حالات اندیشۂ مستور در حاشیۂ نسخ موجود را از همه معانی اولی می داند (خسرو 1872، رسالۂ یکم، 31). چنانچه واژه ای را از لغت پیدا نکرده باشد، با ذکر معنی مستور در حاشیه اکتفا می کند (خسرو 1872، رسالۂ یکم، 59). یا خود چندین شرح های به لغت منظوم عربی به فارسی ابونصر فراهی نگاشته شده به ما معلوم است (نرزیقول 1998، 15-17)، باز در در حاشیۂ مورد نظر اطلاع پیدا می کنیم که مولانا یوسف ابن مانع نام دانشمند به «نصاب الصبیان» شرحی نوشته بوده است (خسرو 1872، رسالۂ یکم، 12).

در حاشیۂ صفحۂ نهم رسالۂ چهارم، ضمن شرح واژۂ «عقل» به معنی خرد و دانش، از شرح مذکور به صورت ذیل معلومات واضیح جای دارد: «عقل: بالفتح، خرد و دانش و آن قوتی است نفس انسان را که بدان تمییز دقایق اشیا کنند و آنرا نفس ناطقه نیز گویند. و مولانا یوسف ابن مانع در شرح «نصاب» نوشته که عقل در اصل لغت مصدر است به معنی بند در پا بستن. چون خرد و دانش مانع رفتن طبیعت می شود، به سوی افعال ضمیمه، لهاذا خرد و دانش را عقل گویند...».

باری، از این نمونه ها بار دگر اهمیت سرچشمه ای اعجاز خسروی تعیین می گردد و باز در خلال حاشیه نگاشتا ها به اسامی اثار دیگری نیز دچار می شویم. برای مثال، در معنی کردن مفهوم «تشبه» از ملا نصیرای همدانی نام دانشمند و «دیباچۂ خاص» وی چنین معلومات ذکر گردیده است: «تشبه: مانند کردن چیزی را به چیزی و با لفظ کردن مستعمل. ملا نصیرای همدانی در دیباچۂ خاص نوشته:

تشبه توان کرد به صحن چمنش لیکن چو نظر کنی در این جا سخنی

است» (خسرو 1876، رسالۂ چهارم، 11).

به این مانند، موارد دیگری نیز، در خلال حاشیه ها به اسامی تعدادی از کتاب و مؤلفان دچار می شویم، به مانند ذکر شیخ عبدالحق نام دانشمند که در «اخبار اخیار» گفته که «لاچن» نام ملک امیر خسرو هم هست (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 22)، «مجمع السیر» نام کتاب از شیخ الاسلام عبدالله انصاری (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 22) وغیره.

همین طور، اعجاز خسروی تنها شرح و معنی داد الفاظ نبوده، بلکه توضیح و تحقیق نیز هست. نظر تحقیقی حاشیه نگار، در میان حاشیه نگاشته ها برملا نمودار می باشد. او از منابع و مآخذ گوناگون به خوبی استفاده کرده و در حالات ضروری مطالب لازمه را به گونه ای خاص تلخیص هم کرده است.

واقعاً، زحمتی که شارح کتاب امیر خسرو متحمل شده، باعث ارج گذاری و شایان تقدیر می باشد، اما در کار او، به نظر ما، چند ایرادی هم وارد است:

الف) به مناسبت بین کلمه های جداگانه به اندازه ای زیاد توجه داشته است که بعضاً حواشی صحفات را کاملاً ذکر چنین مناسبات فرا گرفته است. روش بیان مناسبت بین واژه ها چنین است که مجموع لغات و یا لفت علیهده ذکر گردیده و به کدام کلمه مناسبت داشتن آنها تأکید می شود. مثلاً، الفاظ فلان، فلان و فلان مناسب بهمان، یا خود برای لفظ فلان کلمهٔ بهمان...

ب) تکرار اندیشه نیز خیلی زیاد از یک صفحه به صفحهٔ دیگر می کوچد. به نظر می رسد که حاشیه نگار در حاشیهٔ هر صفحه، به صورت جداگانه شرح کلمات دشوار و مناسبات بین الفاظ مندرج در همان صفحه را هدف اساسی خویش قرار داده است.

پ) در متن اعجاز خسروی واژه های زیاد غیر فارسی نیز استفاده شده اند که آگاهی از معنای آنها در معرفت کلام مهم است. با توجه به امکان حضور معانی چنین واژه ها حاشیه نگار آنهارا بعضاً با معادل هندی و ترکی ذکر کرده است که گاهی به اعتبار روش فکر، در معنی مطلب مورد نظر، هیچ مناسبتی ندارند. مثلاً، واژه های «خصم» و «خسرو» را در نمونه های ذیل بررسی می کنیم:

1. شهسوار دین نصیر الحق توئی کز تو نصرت هاست دین و داد را
چون شوی بر پشت زین لرزد چو تیغ خصم، گر ز آهن کند بنیاد را...

(خسرو 1872، رسالهٔ دوم، 343)

یاد ماند لطف خسرو را و پیش کی فراموشی بود این یاد را

(خسرو 1872، رسالۂ دوم، 344)

توضیح واژۂ «خصم» - در مثال نخست - در حاشیه به طور ذیل است:

«خصم: بالفتح، دشمن و ضعیف و زبون و در هند شوهر را خصم گویند. قبول:

ز بس تندی بصر ها تنگ می گیرند بر مردم

زنان آن جا از این ره خصم می نامند شوهر را.

میر حسن دهلوی:

چند گوئی ز خانۂ کعبه کار با خصم خانه افتادست».

چنین روش شرح، برای دریافت پهلوهاب معنائی واژه های امثال «خصم» که در شعر پارسی بسامد چشمگیر دارند، دارای اهمیت معرفتی اند، اما در متن مورد نظر، منظور فقط معنی لغوی کلمه می باشد و بس. در این مورد چند معنای موقع ندارد. لذا، دریافت معنی منظور مهمتر از معنی ای می باشد که با طور باید و شاید به اعتبار گرفته می شود.

در نمونۂ دوم واژۂ «خسرو» به صورت ذیل شرح یافته است که نمایانگر جنبۂ هنری استفادۂ آن و دریافت معنی امکان بوده و به قضیۂ مربوط ارتبات دارد:

«خسرو: خان آرزو می فرمایند: خسرو: مشهور به ضم اول است و بعضی به کسر خوانند و استاد محقیق می فرمایند که گمان دارم، صحیح به ضم اول و سوم بود. قلب: خورسو، «خور» آفتاب و «سو» فروغ. پس، معنی ترکی آن آفتاب فروغ باشد، با قلب سنجرو که «سنج» به معنی خوب آمده و دور نیست که مبدل خوشرو به معنی خوبرو باشد...».

ضمناً، تهلیل و بررسی واژه شناسی کلام امیر خسرو، با توجه به معیار های زبان شناسی تتبقی، موضوع تحقیقی جالب و ارزش مندی می باشد که محقیق آگاه را می خواهد. در شناخت واژه و ترکیب و عبارات کلام امیر خسرو و برای ورود به عالم رنگین رقص کلمات در سخن منصور متن حاشیه اعجاز خسروی، می تواند به مثابۂ یکی از مفتاحات اساسی خدمت بکند.

ت) به نظر می رسد که مخاطب حاشیه نویس، قبل از همه، خوانندهٔ پارسی خوان شبه قارهٔ هند بوده است، چنکه بعضاً به شرح و معنی داد عباره های رو به رو می شویم که برای خوانندهٔ فارسی زبان معلوم و مفهوم بوده و نیاز به توضیح نمی ماند. در این صورت در برابر عباره ها معادل عربی آنها ذکر می گردد، مثل نمونه های ذیل: روز بد: یوم نحس، روشن کن: ظاهر نما (خسرو 1876، رسالهٔ چهارم، 53)...

روشهای مزبور و مختصات نظر حاشیه نویس تا اندازه ای بیانگر طریق معرفت کلام فارسی در شبه قارهٔ هند نیز می باشد. از این رو، به چند نکتهٔ دیگر اشاره خواهد شد که به مسئلهٔ مزکور گره می خورد: نخست این که شبه قارهٔ هند در زمان امیر خسرو یکی از مشهور ترین مرکزهای رواج هنر و صنعت به حساب می رفت. دلیل واضیح کارنامهٔ همین شاعر و نویسندهٔ توانا در ضمینهٔ سخن فارسی می باشد که حادثهٔ ادبی انکار ناپذیر می باشد. معرفت درست کلام، شناخت ابتکارات و ابداعات و اختراعات امیر خسرو ضمینهٔ بزرگی برای تأمل عمیق در دریافت معانی اعجاز آفر کلام در قالب سخن فارسی گردیده ست که با روشهای آن شناس شدیم. همین منوال، به طور عموم و توجه به معانی لغات به صورت مخصوص در دوره های بعدینه سبب و سرچشمهٔ ابتکارات دیگری در حوزهٔ ادبی شبه قارهٔ هند می گردد.

دیگر این که حاشیه نگار، در حاشیه ای که به عجاز خسروی نگاشته است، توجه به زبان فارسی ماورا النهر داشته است که این حالت بی سبب نیست: در شبه قارهٔ هند زبان فارسی ماورا النهری بیشتر رایج بوده و اغجاز خسروی در تکیه به همین شاخهٔ بزرک زبان فارسی نوشته شده است. این معنی را در خلال حاشیه نگاشته ها هم خواندن ممکن است، به مثل نمونهٔ ذیل: «.. و چون لفظ «نان» به لهجهٔ ایرانیان خوانده شود، «نون» می شود (خسرو 1872، رسالهٔ یکم، 155). یا خود دلیل دیگر این است که غیر از الفاظ عربی تعداد زیاد واژه ءای را که حاشیه نویس با راه ذکر مرادف عربی کلمه معنی کرده است، برای خوانندهٔ امروز تاجیک نیاز به شرح ندارند. مثلاً، در ترکیب «کلید درهای سماوات» برای خوانندهٔ تاجیک شاید واژهٔ «سماوات» نیاز به شرح داشته باشد، اما حاشیه نویس آنرا به صورت «کنز دروازه های آسمان ها» معنی کرده است که معنی «کنز» نه کلید، بلکه گنج، خزینه، دفینه می باشد.

در بارۂ زبان فارسی هند و مناسبت آن به فارسی تاجیکی، توجه امیر خسرو به فارسی ماورا النهر و رواج آن در قلمرو هند تاریخی در خلال تحقیقات دانشمندان نیز می توان با اشاره های قابل توجه برخورد (باره 1934؛ عالماف، انت.؛ سلیمی 1372؛ احمد 1367؛ علی یوف 1968؛ علی مردان اف 1968؛ مختاراف 2008)، اما تحقیق کامل و فراگر این مسئله مجالی دیگر می خواهد.

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولایی ۔ ستمبر،
شمارہ۷۶، ۲۰۰۹ء

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 137 – 150

زبان‌های رسمی هندوستان

سوبهاش کومار [1]

Abstract:

In this article some formal languages of India have been introduced and diversity of languages has also been discussed. The writer has also focused the back ground and linguistic features of some important languages. Moreover the deep roots of each language, its linguistic approach and placement in proper group of language has also been pointed out. Furthermore the geographical impact and political implications have also been pointed out.

Key words: Formal languages, India, Diversity, Implications.

چکیده:

مقاله ای که پیش روی شماست، معرفی زبان‌های رسمی هندوستان را می‌پردازد. در این مقاله، ضمن اشاره به تعدّد زبان‌های رایج در سرزمین هندوستان، دسته ای از زبان‌های رسمی این کشور معرفی شده‌اند. در این معرفی، به طور اجمالی و کوتاه به ریشه شناسی و نسب شناسی هر زبان پرداخته شده و به پیوند هر زبان با گروه‌های اصلی زبان‌های جهان، و همچنین خویشاوندی هر زبان با زبان های دیگر نیز اشاره گردیده است. پس از آن، منطقه‌ی جغرافیایی (و بهتر است بگوییم جغرافیای سیاسی و قومی و ایالتی) و گستره‌ی تکلم هر زبان بررسی شده و رتبه و درصد افراد به کار برنده‌ی هر زبان در مقیاس کشور هند اشاره قرار گرفته است.

---

[1] دانشجوی دورهٔ دکتری ادبیات فارسی دانشگاه تهران، ایران

مقدمه:

سرزمین پهناور هند، با تاریخي به گستره‌ی هزاره‌ها و قرن‌ها، همواره گهواره‌ی فرهنگ‌ها و ادیان و زبان‌هاي بي‌شمار بوده است. در هند، بیشتر از هزار زبان وجود دارد و به هشتاد و هفت زبان روزنامه منتشر می‌شود، به هفتاد و یک زبان نیز برنامه‌ی رادیویی پخش می‌شود، به پنجاه و هشت زبان در مدارس مختلف آموزش داده می‌شود و به پانزده زبان فیلم ساخته می‌شود.(۱) قانون اساسي هندوستان زبان هندی با خط دیوناگری (۲) را زبان رسمي هند شناخته است. (۳) در هند 22 زبان مهم هست که زبان رسمي یکی از ایالات هند هستند و ذیلاً درباره‌ی آن‌ها توضیح خواهیم داد.

1 زبان سنسکریت (۴)

زبان سنسکریت زبان مذهبي آیین‌های هندو ، بودا و جین است و یکي از 22 زبان‌های رسمي هندوستان به شمار می‌رود. در سال 2005م این زبان، به عنوان زبان کلاسیک هند اعلام شد. (۵)

14135نفر (۶) به این زبان صحبت می‌کنند. این زبان گویش خاص شمال غربي هندوستان است، که درسال 1800 قبل از میلاد درکتاب مقدس هندویان به نام ودا ظاهر شده است و مردم این زبان را به اسم "سنسکریت ودایي" مي‌شناسند . ریگ ودا (قدیمی‌ترین کتاب درجهان) به همین زبان نوشته شده و تا به حال باقي مانده است. به این ترتیب زبان سنسکریت به عنوان قدیمي‌ترین زبان هند و اروپایي ثبت شده است . گفته شده است که در زمان معاصر این زبان (سنسکریت ودایي) پایهی خیلي از زبان‌هاي آسیایي است.

ادبیات سنسکریت غنی از شعر درام و متن‌هاي علمي ، فني ، فلسفي و مذهبي است . درحال حاضر هم در مراسم دین هندو روحانیان سرودها را به زبان سنسکریت مي خوانند.

سنسکریت به معني مقدس یا پاک است. این زبان مربوط به دین بوده و بوسیله‌ی مردم دانا استفاده مي‌شده است. این زبان را زبان خدا یا خداوند (۷) نیز مي‌گفتند. در سال 400 قبل از میلاد قدیمي‌ترین دستور باقي مانده به این زبان، استادیایي (۸) یعني

هشت باب بوسیله‌ی پانیني نوشته شد.(۹) سنسکریت یکي از وابسته‌هاي خانواده‌ی هندو آریایي و همخانواده‌ی زبان‌هاي هندو اروپایي است و با زبان‌هاي ایراني درشاخه‌ی هند و ایراني مرتبط است .

سنسکریت ودایي

سنسکریت ودایي زبان ودا(۱۰) است که مجموعه‌ی بزرگ سرودهاي مذهبي (مخصوصاً ستایش خدا) مي باشد و بیشتر مربوط به دین هندو، و شامل بحث‌هاي فلسفي است.

سنسکریت کلاسیک

بعد از دوره‌ی ودایي دو حماسه‌ی بزرگ راماین و مهابهارت نوشته شد. مهابهارت یعني هند بزرگ؛ این کتاب تاریخ ، فرهنگ و اجتماع را توصیف مي‌کند . نویسنده‌ی آن شخصي به نام ویاس(۱۱) است و نویسنده‌ی راماین والمیکي(۱۲) مي‌باشد . دراین دوره یک نویسنده‌ی دیگرکه اسمش کالیداس(۱۳) بود و بسیار شهرت داشت، کتاب‌هاي کومارسمبهوم(۱۴) و رگهوونشم(۱۵) و ... را نوشت .

قانون اساسي دین هندو که به اسم "قانون منو"(۱۶) معروف است، گیت گووینند (۱۷) تألیف جیدیو(۱۸)، ارتهشاسترا(۱۹) تألیف چانکیا(۲۰) و کامسوترا(۲۱) از واتساین(۲۲) از آثار مشهور این دوره هستند.

2 زبان هندي(۲۳)

زبان هندي، یک زبان هند و اروپایي است که مخصوصاً در شمال و مرکز هند به آن گفتگو مي شود. این زبان که به وسیله‌ی دولت هند رسمیت یافته است، سومین زبان دنیا پس از زبان چیني و انگلیسي شمرده مي شود .

قانون اساسي هندوستان درسال 1950 این زبان را به عنوان زبان رسمي انتخاب کرد. این زبان در ایالت‌هاي بیهار،(۲۴) ژارکند،(۲۵) اوتراکهند،(۲۶) مدهي پرادیش،(۲۷) راجستهان،(۲۸) اوتر پرادیش،(۲۹) چهتیس گره،(۳۰) هریانا(۳۱) و دهلي به عنوان زبان رسمي به کار مي رود. 422/048/642 نفر یعنی 41/03 درصد از جمعیت هند به این زبان سخن مي‌گویند. (۳۲)

زبان شناسان اين مساحت را « منطقه‌ی هندي زبانان » ناميده‌اند . درشهر های بمبئي ، احمد آباد ، کلکته ، حيدرآباد و چنديگره(۳۳) زبان هندي رواج يافته است .

لهجه‌هاي هندي خيلي زياد است و قابل شمردن نيست ، ولي يک دانشمند به نام تيواري(۳۴) به طورکلي آن‌ها را درپنج گروه تقسيم کرده است :

1. هندي غربي
2. هندي شرقي
3. راجستاني(۳۵)
4. پهاري(۳۶)
5. بيهاري(۳۷)

3 زبان اردو(۳۸)

نام " اردو" از کلمه ترکي Ordu به مفهوم " سپاه " گرفته شده است . اين زبان يک زبان هند و آريايي وابسته به خانواده‌ی هند و اروپايي است . اين زبان يکي از زبان هاي رسمي هند است. تأثير زبان فارسي و عربي در اين زبان خيلي زياد ديده مي شود . اين زبان خيلي نزديک به زبان هندي است . زبان‌های هندي و اردو را با هم زبان " هندوستاني " مي‌دانند . بعد از زبان عربي و فارسي بخش عمده اي از کتاب‌هاي ادبي اسلامي نيز به همين زبان نوشته شده است .

مکالمه کنندگان اين زبان 51/536/111 نفر هستند که 5/01 در صد جمعيت هند به شمار می روند. (۳۹)

زبان اردو در ايالت‌هاي آندرا پرادیش،(۴۰) بيهار، جمبو و کشمير،(۴۱) اوتر پرادیش و دهلي به عنوان زبان رسمي به کار مي رود .

دراين زبان چهار لهجه شناخته شده است:

1. دکهيني(۴۲)
2. پينجري(۴۳)
3. ريخته(۴۴)
4. اردوي جديد

4 زبان بنگالي(۴۵)

زبان بنگالي يک زبان هند و آريايي است و زبان مادري يکي از ايالات هند به نام " بنگال غربی " است. 83/369/769 نفر به اين زبان صحبت مي کنند که 8/11 درصد از مردم هند هستند(۴۶) مقام اين زبان در هند دوم است. معمولاً سه دوره درتاريخ زبان بنگالي شناخته شده است.:

1. بنگالي کهنه يا قديمي (1000/900 تا 1400 ميلادي)
2. بنگالي ميانه (1400 تا 1800 ميلادي)
3. بنگالي نو يا جديد (از1800 ميلادي به بعد)

تا قرن 18 ميلادي هيچ دستور زبان بنگالي نوشته نشده بود . اولين فرهنگ / دستور زبان بنگالي توسط يکي از مبلغين (مأموران) پرتغالي " Manoel de Assumpcam" بين 1734 تا 1742 ميلادي نوشته شد . او آن وقت در بهاول(۴۷) کارمند بود . يک دستور نويس انگليسي Nathaniel Brassey Halhed نيز دستور جديد زبان بنگالي را نوشت . همچنين راجار رام موهن راي(۴۸) نيز که يک اصلاح طلب بزرگ، درسال 1832 دستور زبان بنگالي را نوشت .

اين يکي از زبان هاي رسمي هندوستان است که در ايالت بنگال غربي به شکل زبان رسمي استفاده مي شود و زبان دوم ايالت‌های تريپورا(۴۹) و آسام(۵۰) است . سرود ملي هند به زبان بنگالي بوسيله رابيندرانات تاگور(۵۱) نوشته شده است. او يکي از معروف‌ترين نويسندگان زبان بنگالي بود که نه تنها در هند بلکه درجهان مشهور بود و در ادبيات، جايزه نوبل را دريافت کرد. از ديگر نويسندگان معروف در اين زمينه شرط چندر چطوپايدهياي(۵۲) و بنکيم چندر چطرجي(۵۳) بودند.

5 زبان گجراتي (۵۴)

گجراتي زبان رسمي و مادري ايالت گجرات است و 46/091/617 نفر به اين زبان سخن مي‌گويند كه 4/48 درصد از مردم هند می باشد. (۵۵) اين زبان كه هفتمين زبان مهم هندوستان است از زبان‌هاي عربي و فارسي تاثير زيادي گرفته است. آثار مهم آن متعلق به مذهب جين(۵۶) بوده و اين بزرگترين سرمايه‌ی ادبي است كه پيروان كيش جين، علاوه برآنچه به زبان سنسكريت نوشته‌اند ، به وجود آورده‌اند . اين آثار مشتمل بر ترجمه شرايع و اقتباس از متون كهن است و نيز نوعي ويژه موسوم به راس(۵۷) يا حكايات اخلاقي است كه آغاز آن را مي توان قرن 14 ميلادي دانست . انتشار اين قبيل آثار تا امروز هم ادامه دارد.

6 زبان مراتهي(۵۸)

زبان مراتهي زبان هند و آرايي است و در ايالت مهاراشترا(۵۹) به كار برده مي‌شود و زبان رسمي مهاراشترا است. 71/936/894 نفر به اين زبان تكلم مي‌كنند كه 6/99 درصد از جمعيت هند هستند.(۶۰) از لحاظ زبان مادري، اين زبان در هندوستان مقام چهارم را دارد و تقريباً از1500 سال قدمت برخوردار است . در زمان قديم اين زبان را مهاراشتري(۶۱)، مهاراتهي(۶۲)، ملهاتي(۶۳) يا مرتهي(۶۴) مي ناميدند. اين زبان مخصوصاً در مهاراشترا استفاده مي شود. ولي تا اندازه اي در ايالت‌هاي همسايه‌ی آن مانند گجرات ، مدي پرادیش، گويا، كرناتک، و آندرا پرادیش هم به كار مي رود .

7 زبان تاميل(۶۵)

زبان تاميل يكي از قديمي ترين زبان‌هاي دنيا است كه كهن ترين آثار ادبي در آن به جا مانده است. اين زبان در هند مخصوصاً در ايالت تاميل نادو(۶۶) به كار مي‌رود و در سال 2004م به عنوان زبان كلاسيک هند اعلام شد. (۶۷) اين زبان به خانواده‌ی " زبان دراويدي" تعلق دارد و مردم ايالات كرناتک ، كرالا(۶۸) و مهاراشترا نيز به اين زبان سخن مي گويند.

اين زبان تقريباً 22 لهجه دارد و 60/793/814 نفر به اين زبان سخن مي گويندكه 5/91 درصد از جمعيت هند است. (۶۹)

8 زبان کنر(۷۰)

کنر یکي ازقدیمي‌ترین زبان‌هاي هند از خانوداه‌ی زبان‌هاي دراویدي است که به خصوص در جنوب هندوستان صحبت مي‌شود و در سال 2008م به عنوان زبان کلاسیک هند اعلام شد. (۷۱)

37/924/011 نفر به این زبان سخن مي گویند که 3/69 درصد از جمعیت هند هستند. (۷۲) این زبان، یکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان و ایالت کرناتک است و خطي مخصوص به خود دارد که به خط کنر معروف است. این زبان در ایالت کرناتک و ایالت هاي همسایه مانند آندرا پردیش، مهاراشترا، تمیل نادو، کرالا و گوآ استفاده مي شود و تقریباً 20 لهجه دارد.

9 زبان ملیالم (۷۳)

این زبان در ایالت کرالا به کار مي رود و یکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان است که با خانواده‌ی زبان‌هاي دراویدي وابستگي دارد . این زبان به زبان تامیل بسیار نزدیک است، حتي بعضي آن را لهجه اي از زبان تامیل مي‌دانند . این نزدیکي ، بخصوص از لحاظ ادبي کاملا مشهوراست. 33/066/392 نفرکه 3/12 درصد از جمعیت مردم هند است، به این زبان سخن مي گویند. (۷۴) یک مأمور آلماني به اسم هرمن گندرت(۷۵) اولین لغت نامه‌ی ملیالم را تألیف کرد .

10 زبان ته لوگو(۷۶)

ته لو گو یکي از پرجمعیت ترین زبان‌هاي دراویدي است که 74/002/856 نفر به آن سخن مي گویند که 7/19 درصد از جمعیت مردم هند هستند(۷۷) و در سال 2008م به عنوان زبان کلاسیک هند اعلام شد. (۷۸)

این نزدیکترین گویش به زبان هند و آریایي ، حداقل از نظر لغات، و دورترین گویش از زبان تامیل است . این زبان یکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان و ایالت آندرا پرادیش است و سومین زبان مهم در هند بعد از هندي و بنگالي شمرده مي‌شود که بیشتر مردم آندراپرادیش آن را به کار مي برند. ته لو گو، یکي از زبان هاي برخوردار از موسیقي کلاسیک جنوب هندوستان است. این زبان معروف به "

ايتاليايي شرق " است، به دليل آن كه گفتار آواي هر كلمه با يک مصوت تمام مي‌شود، از اين جهت اين زبان بسيار شيرين است.

ته لوگو بخصوص در ايالت آندرا پرديش و نيز در ايالت‌هاي همسايه مانند تميل نادو ، كرناتكا و اوريسا استفاده مي شود .

11 زبان(۷۹)

زبان پنجابي هم از زبان‌های زبان هند و اروپايي است و درايالت‌هاي پنجاب، هريانا بطور زبان رسمي به كار مي‌رود و در دهلي به عنوان زبان دوم استفاده مي‌شود. تعداد متكلمان به اين زبان 29/102/477 نفرند كه 2/83 درصد از جمعيت مردم هند هستند. (۸۰) اين زبان نزديک به زبان هندي است و تأثير فارسي و عربي هم در آن ديده مي شود. ادبيات مذهبي قوم سيک نيز به اين زبان نوشته شده است.

12 زبان كشميري(۸۱)

اين زبان از جمله زبان‌هاي هند و ايراني است و مردم ايالت كشمير به اين زبان سخن مي گويند .اين يكی از زبان‌هاي رسمي هندوستان است و 5/527/698 نفر به آن حرف مي زنند كه 0/54 درصد از مردم هند هستند. (۸۲) اين زبان خط خاص خود يعني" الفباي شاردا" را تقريباً كنارگذاشته و از الفباي عربي (با تغييراتي اندک) استفاده مي كند.

13 زبان سندي(۸۳)

زبان سندي يک زبان هند و آريايي و يكی از زبان‌هاي رسمي هندوستان است . در اين زبان تأثير زبان دراويدي ديده مي شود . بيشتر استفاده كنندگان اين زبان در منطقه‌ی سند(۸۴) هستند. اين زبان لهجه‌هاي مختلف دارد و در ايالت‌های گجرات و راجستان به آن‌ها صحبت مي‌شود . حدود 2/535/485 نفر به اين زبان سخن مي‌گويند كه 0/25 درصد از مردم هند هستند. (۸۵)

14 زبان آسامي(۸۶)

اين يک زبان هند و آريايی است و در ايالت آسام که در شمال شرق هند است، صحبت مي شود. (۸۷) زبان آسامی يکي از زبانهاي رسمي هند است و 13/168/484 نفر به آن سخن مي گويند که 1/28 درصد از جمعيت مردم هند هستند. (۸۸) اين زبان همريشه با زبان‌هاي بنگالي و اوريا است و به چهار لهجه تقسيم مي شود.

15 زبان اوريا(۸۹)

اين زبان که يکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان است و از خانواده‌ی زبان‌هاي هند و آريايي به شمار می رود نزديک به زبان بنگالي است. 33/017/446 نفر به اين زبان حرف مي زنند که 3/21 درصد از جمعيت هند هستند. (۹۰) مردم ايالت اوريسا(۹۱) و مناطق هم مرز اين ايالت مانند بنگال غربي و ژارکند، اين زبان را به کار مي برند . در اين زبان نشانه‌هاي تاثير زبان‌های عربي و فارسي خيلي کم ديده مي شود .

16 زبان ميتهيلي(۹۲)

زبان ميتهيلی يک زبان هند و آريايي است و يکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان است. اين زبان بخصوص در ايالت بيهار صحبت مي شود. در هند 12/179/122نفر به اين زبان سخن مي گويند که 1/18 درصد از جمعيت مردم هند هستند. (۹۳)

17 زبان نپالي(۹۴)

اين يکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان است و در ايالت سيکيم(۹۵) به شکل زبان رسمي به کار مي رود و2/871/749 نفر به اين زبان سخن مي‌گويند که 0/28 درصد از جمعيت هند است. (۹۶) اين زبان نزديک به زبان هندي است و از زبان‌هاي مختلف مانند فارسي ، انگليسي و سنسکريت ، لغات بسيار اخذ کرده است .

18 زبان سنتهالي(۹۷)

اين يک زبان آستروآسياتيک(۹۸) است و6/469/600 نفر در هند به اين زبان سخن مي‌گويند که 0/63 درصد از جمعيت هند هستند. (۹۹) بيشتر گويندگان اين زبان از ايالت‌هاي ژارکند، آسام ، بيهار، اوريسا ، تريپورا و غرب بنگال هستند . اين زبان

الفباي مخصوص به خود را دارد که با اسم اول چيکي(۱۰۰) مشهور است. اين زبان هم يکي از زبان‌هاي رسمي هندوستان به شمار مي‌رود.

19 زبان بودو(۱۰۱)

زبان بودو درشمال شرق هند رايج است و در ايالت آسام به شکل زبان رسمي به کار مي‌رود و اين زبان از خانواده‌ی چينی- تبتی(۱۰۲) است. (۱۰۳) اين يکی از زبان‌های رسمی هند است و 1/350/478 نفر متکلم دارد که 0/13 درصد از جمعيت هند هستند. (۱۰۴) اين زبان رسماً با خط ديوناگري نوشته مي‌شود و به اين زبان شعر، نمايشنامه، داستان کوتاه، رمان، زندگي‌نامه و سفرنامه‌هاي بسياري نوشته شده است .

20 زبان کونکني(۱۰۵)

اين زبان درگوآ، ساحل جنوبي مهارشترا ، ساحل کرناتک و کرالا رواج دارد و يک زبان هند و آرياييي است. در هر منطقه، لهجه‌ی خاصي از اين زبان رواج دارد. اين زبان يکي از زبان‌هاي رسمي هند است و بيشتر در ايالت گوآ به صورت زبان رسمي به کار مي رود . اين زبان رسماً با خط ديوناگري نوشته مي شود. 2/489/015 نفر به اين زبان سخن مي‌گويند که 0/24 درصد از جمعيت هند هستند و بيشتر آن‌ها اهل گوآ هستند. (۱۰۶)

21 زبان منيپوري(۱۰۷)

اين يکی از زبان‌های رسمی هند است و در ايالت‌هاي منيپور(۱۰۸) و آسام و تريپورا(۱۰۹ به صورت زبان رسمي استفاده مي‌شود. 1/466/705 نفر که 0/14 درصد جمعيت مردم هند می باشد، به اين زبان حرف مي‌زنند. (۱۱۰)

22 زبان دوگري(۱۱۱)

اين زبان از گروه زبان‌های هند و اروپايی است و يکی از زبان‌های رسمی هند به شمار می‌رود و بخصوص در ايالت‌های جامو و کشمير، پنجاب و هيماچل پرادیش 2/282/589 نفر بدان تکلم مي‌کنند که 0/22 درصد از مردم هند هستند. (۱۱۲)

منابع:

1. Dalby, Andrew, Dictionary of Languages, A & C Black, Landon, 2006
2. http://censusindia.gov.in/Census_Data_2001/Census_Data_Online/Language/Statement1.htm
3. http://pib.nic.in/release/release.asp?relid=44340
4. http://www.censusindia.gov.in/Census_Data_2001/Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
5. http://www.hindu.com/2004/09/18/stories/2004091806530100.htm
6. http://www.hindu.com/2005/10/28/stories/2005102809281200.htm
7. http://www.pib.nic.in/release/release.asp?relid=44340
8. http://www.teck.in/facts-about-indian-languages.html
9. The Constitution of India, Ministry of Law and Justice, Government of India, New Delhi, 2007
10. Trautmann, Thomas R, Languages and nations: conversations in colonial south India, University of California, California, 2006

REFERENCES

(1) http://www.teck.in/facts-about-indian-languages.html
(2) Devanagari
(3) P.212 Constitution of India
(4) Sanskrit
(5) http://www.hindu.com/2005/10/28/stories/2005102809281200.htm
(6) http://censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement1.htm
(7) Deva-bhasha
(8) Astādhyāyī
(9) P.46 Languages and Nations
(10) کتاب مقدس هندویان
(11) Vyasa
(12) Valmiki
(13) Kalidas
(14) Kumar Sambhavam
(15) Raghuvansham
(16) Law of Manu
(17) Geeta Govinda
(18) Jayadeva
(19) Arthshastra
(20) Chanakya
(21) Kamasutra
(22) Vatsyayan
(23) Hindi
(24) Bihar
(25) Jharkhand
(26) Uttarakhand
(27) Madhya Pradesh
(28) Rajsthan
(29) Uttar Pradesh
(30) Chattisgarh
(31) Haryana
(32) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online / Language/Statement4.htm
(33) Chandigarh
(34) Tiwari
(35) Rajsthani
(36) Pahari
(37) Bihari
(38) Urdu
(39) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online /Language/Statement4.htm
(40) Andhra Pradesh

(41) Jammu & Kashmir
(42) Dakhini
(43) Pinjari
(44) Rikhte
(45) Bengali
(46) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(47) Bhawal
(48) Raja Ram Mohan Roy
(49) Tripura
(50) Assam
(51) Rabindra Nath Tagore
(52) Sharat Chandra Chattopadhyay
(53) Bankim Chandra Chatrajee
(54) Gujrati
(55) http: //www.censusindia.gov.in /Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(56) Jain
(57) Rasa
(58) Marathi
(59) Maharashtra
(60) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(61) Maharashtari
(62) Maharathi
(63) Malhati
(64) Marthi
(65) Tamil
(66) Tamilnadu
(67) http://www.hindu.com/2004/09/18/stories/2004091806530100.htm
(68) Kerla
(69) http; //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(70) Kannada
(71) http://pib.nic.in/release/release.asp?relid=44340
(72) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(73) Malyalam
(74) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(75) Hermann Gundart
(76) Telugu
(77) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(78) http://www.pib.nic.in/release/release.asp?relid=44340
(79) Punjabi

(80) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(81) Kashmiri
(82) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(83) Sindhi
(84) Sindh
(85) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(86) Assamese
(87) P41. Dictionary of Languages, Andrew Dalby
(88) http: //www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(89) Oriya
(90) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online / Language/Statement4.htm
(91) Orissa
(92) Maithili
(93) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(94) Nepali
(95) Sikkim
(96) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online / Language/Statement4.htm
(97) Santhali
(98) Austroasiatic
(99) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online / Language/Statement4.htm
(100) Ol Chiki
(101) Bodo
(102) Sino-Tibbatan
(103) P94 Dictionary of Languages, Andrew Dalby
(104) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm

(105) Konkani
(106) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(107) Manipuri
(108) Manipur
(109) Tripura
(110) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm
(111) Dogari
(112) http://www.censusindia.gov.in / Census_Data_2001 / Census_Data_Online/Language/Statement4.htm

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولایی ۔ ستمبر،
شمارہ۷۶، ۲۰۰۹ء

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 151 – 166

الشعر الفارسي في مرحلة التجديد نيما يوشيج نموذجاً

د.أحمد موسى [1]

Abstract:

The classical Persian poetry went through drastic structural changes during and after the Constitutional Movement. New themes and fresh ideas were introduced and a new chapter of Persian poetry was unveiled. Nima Ushij is rightly considered and known as the founder of modern Persian poetry but there are quite a few poets who played their part and discovered new heights and Sohrab Sepehri is one of them. In this article, the writer has thrown light on his poetry and furthermore added Arabic translation of some famous poem of this great modern age poet.

Key words: Modern Persian poetry, Changes, Sohrab's contribution.

يعتبر شعر الثورة الدستورية (المشروطة) (1906-1908م) والشعر المعاصر عموماً استمراراً للحركة المنطقية للشعر الكلاسيكي الفارسي في العهد الجديد. فبالرغم من التفاعل الذي طبع الأدب الفارسي المعاصر والثقافة والأدب الغربيين وتأثر الأول بالثاني، إلا أنه احتفظ بطابعه وصبغته الإيرانية. ولعل أفضل تعبير نصوّر به علاقة الأدب المعاصر بالأدب والثقافة الكلاسيكيتين، هو تعبير "الأبوة والبنوة"، فذاك الأب

---

[1] أستاذ اللغة الفارسية و آدابها بجامعة شعيب الدكالي – الجديدة- المغرب

بدون هذا الابن يبقى عقيماً، وهذا الابن بدون ذاك الأب يضحى عديم الأصل. لذلك يمكن اعتبار شعر ثورة المشروطة استمراراً للمسار الذي قطعه الشعر الفارسي طيلة قرون و عصور طويلة. فتارة بثّ – في شكله الحماسي - في جسد الثقافة الجريح روح الأمل والاستقلال والهوية والحرية، وتارة قرّر حكاية غربة الإنسان في العالم السفلي، وأحياناً أخرى كان بلسماً شافياً لروح الناس بتوجهه الجدي نحو العشق الإنساني الطاهر...واليوم في عصرنا يجدر به ربط الاتصال بالإنسان معلناً عن ولادة جديدة.

ولو أردنا التعرّض لبعض الخصوصيات الأساسية الفكرية والثقافية للإيرانيين والتي أبعدتهم عن الأدوار الكلاسيكية، لنرى ما هي مشخصات ومميزات الثقافة الإيرانية في الفترة المعاصرة لاستطعنا تحديد ذلك في الخصائص التالية :

1. نبذ القديم أو التقليد :

بنظرة مجملة في الظروف الاجتماعية والثقافية ندرك أن نبذ القديم هو خصوصية أساسية ميّزت الثقافة الإيرانية المعاصرة. وتتجلى آثار هذه الخصوصية في كل مستويات الثقافة وطبقات المجتمع. فعلى سبيل المثال فقد انكسرت الحكومات التقليدية. ففي السابق لم يكن للشعب أي دور في اختيار الحاكم، أما اليوم فلم يعد الأمر كذلك. كما طرأ التغيير على شكل القوى السياسية، فلم يعد أصحاب القوى السياسية من المسئولين أو القائمين على المصالح يُنعتون ب**"سايه خدا"**(٢)(ظل الله). كما تجلت هذه الخصوصية في العلاقات الاجتماعية أيضاً. فإذا كانت المرأة في القديم موجوداً متوارياً عن الأنظار، فهي اليوم لم تعد كذلك. يمكن أن نلاحظ هذا أيضاً في السلوكيات الجماعية والعادات والتقاليد الجديدة، بدءً من لباس كل من المرأة والرجل ووصولاً إلى السلوك المتحضّر والمنفتح.

إذن فقد ظهرت في الأدب المعاصر الإيراني ونخص بالذكر الشعر، موضوعات ومضامين لم تكن مطروقة في الألفية السابقة بأكملها. موضوعات كحقوق الشعب على الحكومة والحرية بالمعنى السياسي للكلمة والتعليم والتربية الحديثة والقومية والتعصب للوطن، وموضوعات أخرى من هذا القبيل. لذلك يمكن القول أن نبذ التقليد الذي بات خصوصية ذاتية في الثقافة المعاصرة تجلى أيضاً في نظم الشعر.

2. السرعة :

الخصوصية الأخرى للثقافة الإيرانية المعاصرة هي السرعة، فالسرعة هي النتيجة الأولية لمكننة الحياة. ففي القديم كان تغيير خصوصية ثقافية يستغرق عشرات السنين إن لم نقل المئات، أما اليوم فأصبح التغيير و التحول يقع بوتيرة سريعة جداً.

ويكفي إلقاء نظرة على التحولات الثقافية خلال الخمسين سنة الأخيرة في إيران لندرك مظاهر هذه السرعة في ميدان الثقافة والاجتماع. لكن قصدنا في هذه المقالة هو بيان هذا المسار في نطاق الأدب، فمن علامات هذا التغيير في الأدب والشعر على وجه الخصوص هو اهتمام القراء والكُتّاب والشعراء وتوجههم نحو قوالب أدبية قصيرة لا يستغرق قراؤها وقتاً كثيراً. فاليوم لا طاقة لأي شاعر على نظم ستة دفاتر مطولة كما فعل جلال الدين الرومي في المثنوي أو قرض ستين ألف بيت على شاكلة الشاهنامة، و حتى إذا وُجد من يفعل ذلك فلن يجد من يقرأ عمله. لهذا السبب أصبحت اليوم الأشعار والقصص القصيرة أهم القوالب الأدبية الرائجة. ذلك لأن نفسية أهل الثقافة و ذهنيتهم تأثرت بعامل السرعة الذي ذكرناه.

3. تغير الرؤى والعقائد :

لقد غيَّر التعامل مع الغرب في الفترة المعاصرة أسس رؤى ومعتقدات الإيرانيين. ففي الفترة الكلاسيكية – كما يبدو من الآثار الأدبية – كان التوجه والاهتمام بالدنيا مخالفاً للقيم والمبادئ، خاصة في الفلسفة الصوفية، فأشياء من قبيل المال والجاه والمقام كانت تعتبر من العوائق المانعة لوصول الإنسان لدرجة الكمال.

فقد كان الإنسان يبني لليوم الآخر ويعمل للدنيا الأخرى وتتضح هذه العقيدة بجلاء في الحياة الدنيوية (نيم نانى مى رسد تا نيم جانى در تن است) أي : نصف كسرة خبز تكفي لتبقى الروح في الجسد.

لكن في الفترة المعاصرة تغير تعريف ومنزلة الإنسان في الوجود جذرياً. فإذا كان الإنسان في القديم يُعرَّف على أنه حيوان ناطق أو حيوان عاشق، فاليوم أصبح الإنسان حيواناً سياسياً. فالسياسة والقوة السياسية تحتل من الإنسان اليوم مركز الريادة وكل

المعادلات. إن "الإنسان في الدنيا" اليوم محط الاهتمام وليس "الإنسان في الآخرة" أو "الإنسان في سماء الفناء الصوفي".

حتى مفاهيم من قبيل "العشق" أصبح لها تعريفها الخاص في العهد الجديد يتفاوت كلياً مع تعريفها في العهود القديمة، فالمعشوق اليوم هو ذاك المعشوق الأرضي، وهو في مفهومه المتعالي والسامي عبارة عن تلك المفاهيم السامية مثل العدالة والإنسانية وليس هو ذاك المعشوق العلوي الذي لا يصله أحد. لقد نزل العشق من السماوات والأفلاك إلى الأرض واتخذ لنفسه لوناً أرضياً..وكل هذا يتجلى بوضوح في الشعر المعاصر..

4. تغيُّر الذوق الجمعي :

النتيجة الأولى لتغير الرؤى والعقائد هي بلا شك تغير الذوق الجمعي للإنسان المعاصر أو الحديث، فنظرة سريعة إلى نوع اللباس وطريقة التزيّن للرجال والنساء على حد سواء، وكذلك أسلوب العمران والمدن ومقارنة ذلك بالسابق يُظهر بجلاء التغير العميق الذي طرأ على الذوق الجمعي للإيرانيين في العهد الحديث (الفترة المعاصرة). وليتضح هذا التغيير أكثر نقوم بمقارنة خصوصيات المعشوق في الأدب الكلاسيكي بالمعشوق في الأدب الحديث بجنسيه الشعر والسرد. ففي الأدب الكلاسيكي كان شَعر المعشوق أسوداً دائماً وطوله يصل حتى الصين، وثغر المحبوب كان بصغر نقطة وقوامه يشبه شجر السرو وخدوده منتفخة ووردية اللون، وحركاته تشبه حركات الغزال، وكان هذا المعشوق بعيد المنال وغارقاً في هالة من القدسية والإبهام بعيداً عن الجنس...لكن المعشوق في الأدب المعاصر له خصوصيات متفاوتة تماماً. إن المعشوق الكلاسيكي لا وجود له في شعر ولا في المجتمع اليوم. فإذا كان الذوق الجماعي للقدماء في الأدب يستحسن آهات ومعاناة العاشق المؤلمة وتعالي المعشوق، فإن جيل اليوم يعتبر هذا السلوك من قبيل الاختلال الروحي والنفسي. لقد تحول فضاء الأدب الكلاسيكي النير إلى عالم مظلم في الشعر والأدب المعاصرين. ويكفي لمعرفة ذلك مقارنة نسبة الألوان الفاتحة والقاتمة في الأدبين القديم والحديث. لذلك فإن الذوق الجمعي للأدباء المعاصرين – والذي يُعبّر عن ذوق وسليقة المجتمع بأكمله – ينطوي على أشياء جميلة لم تكن كذلك

في الشعر الكلاسيكي والعكس صحيح، وتبرز أهمية هذا الموضوع في دراسة صور الأخيلة في الشعر المعاصر.

5. كثرة الالتزامات وقلة الوقت ووفرة التسلية :

وهذه كذلك خاصية من خصوصيات الثقافة المعاصرة التي ظهرت مع تغير حياة الإنسان من حياة زراعية إلى صناعية آلية. فإذا كان القدماء يقضون ليالي الشتاء الطويلة في قراءة الشاهنامة وسائر الأنواع الأدبية لسبب قلة المشاغل ووفرة الوقت وانعدام التسلية، فإن حياة المدينة والصناعة والآلة كسَّرت كل هذه المعادلات وأحدثت نظاماً جديداً غيَّر الإنسان تغييراً كبيراً حتى أصبح مثل الآلة. وقد أثر كل هذا على الآثار الأدبية كلها دون استثناء.

إن التطورات التي شهدتها إيران بعد عام 1921م تمخضت عن أدب وشعر جديدين، سُمي فيما بعد بالشعر "النيمائي" (٣)نسبة إلى نيما يوشيج الشاعر الإيراني المعاصر موضوع الدراسة في هذه المقالة، ولعله من نافلة القول أن نشير إلى أن ميزان شعر نيما يوشيج يتوزع على عدة أمور:

أولاً : الانطلاق من الشعر الكلاسيكي وقيوده التي فرضت نفسها على الساحة الأدبية في إيران لمدة إحدى عشر قرناً.

ثانياً: إن هذه المرحلة ممزوجة بمعترك الحياة الاجتماعية والسياسية والثقافية بحيث لا يمكن انفصامها، ومن يريد الولوج إلى أدب عصر النهضة في إيران يفرض عليه تتبع هذه الفترة من تاريخ إيران ونشاطها في مختلف الميادين عن كثب، وأن يأخذ بعين الاعتبار الانفتاح السياسي على أوربا في العصر القاجاري، ولاسيما عهد عباس ميرزا (نائب السلطنة) وكذلك الحروب الروسية الإيرانية. (۴)

أضف إلى ذلك حدوث الثورة الدستورية وما انبثق عنها من نتائج إيجابية، نلخص أهمها فيما يلي:

- تداعيات الحرب الروسية الإيرانية وضرورة الانفتاح على تكنولوجيا متطورة وعصرية.
- النهوض لتعلم العلوم والفنون العصرية إثر الجهود التي بذلها عباس ميرزا.

- الانفتاح على العالم الجديد وتبادل الوفود الطلابية وغير الطلابية.
- انتشار صنعة الطباعة.
- انتشار الصحف والمطبوعات.
- ترجمة وطبع الكتب المترجمة من اللغات الأجنبية.
- تأسيس مدرسة دار الفنون. (٥)

إذن على إثر انتشار الحريات و المبادئ الديمقراطية في إيران وشيوع التعليم في كل أنحاء إيران انبرى الأدباء والشعراء لمشاركة الشعب في أفكارهم وتركوا الأدب السلطاني (أدب البلاط). ونستطيع القول أن الشعر والأدب قد تغلغلا في حياة الناس فعلا.

إن الحياة الاجتماعية والسياسية الجديدة انبثقت عنها كلمات ومصطلحات طغت على الساحة الأدبية، وأكثرَ الأدباء من استعمالها وعلى سبيل المثال نذكر المفردات التالية : آزادى (الحرية)، وقانون، ووطن، و مصطلحات أخرى تنتمي إلى حقول التعليم العصري والعلوم والتكنولوجيا المتطورة. وقد ألقت هذه التطورات الاجتماعية التي شهدتها إيران بعد ظهور واستقرار الثورة الدستورية بظلالها على كافة مناحي حياة الإيرانيين، بحيث لم يقتصر تأثيرها على المؤسسات الاجتماعية والاقتصادية بل طال أيضاً الأفكار والعقائد والآداب والتقاليد.

و حسب الدكتور إسماعيل حاكمي فإنه يقسّم المجموعات الشعرية لعصر المشروطة منذ انطلاقة بوادر فكر الحرية حتى السنوات المتزامنة مع 1882م وما بعدها إلى أربع أو خمس مجموعات يجعل شاعرنا نيما يوشيج على رأس المجموعة الثالثة التي برزت في أواخر هذا العصر والتي تميز أعضاؤها وأنصارها برؤية أعمق للأمور والقضايا من الأبعاد الاجتماعية وكذلك إلمامهم بالجوانب الفنية للشعر لاسيما من زاوية الإطلاع على التطورات الأدبية في أوربا فإنه يمكننا أن نتصور أن عدد هذه المجموعة قليل جداً لكن تأثيره اتسم بأهمية بالغة. وهذه المجموعة تضم إضافة إلى نيما أبا القاسم لاهوتي، وشعراء آخرين، وهؤلاء يجب تسميتهم ب "ميسرة شعر المشروطة" في القضايا الاجتماعية وفي أصول ومبادئ نقد الشعر. بدأت هذه المسيرة مع إنشاد وظهور أشعار مثل (افسانه :الأسطورة) لنيما يوشيج وما تزال مستمرة حتى الآن. لقد وسع "نيما" دائرة

التجسيدات والأوصاف وقرب الشعر لطبيعة البيان وواقع الحياة. ورغم أن "الأسطورة" كانت وصفاً لأوضاع الشاعر وبياناً لتفاصيل محل ولادته لكنها في نفس الوقت تعد انطلاقة في مضمار الشعر الفارسي الجديد.

ولد سهراب سپهري عام 1928م في مدينة "كاشان" و تخرج عام 1953م من كلية الفنون الجميلة بطهران. نشأت رغبته في الرسم موازية لرغبته في الشعر، حيث كان بالإضافة إلى إصدار مجاميعه الشعرية يقيم معارض لرسومه في مختلف أنحاء طهران، وفي بعض الأحيان كان يقيم أمسيات شعرية في هذه المعارض :

اهل كاشانم

پيشه ام نقاشی است

گاه گاهی قفسی می سازم با رنگ، می فروشم به شما

تا به آواز شقايق كه در آن زندانی است

دل تنهايی تان تازه شود.

چه خيالی، چه خيالی،...می دانم

پرده ام بی جان است.

خوب می دانم، حوض نقاشی من بی ماهی است (۶)

الترجمة :

من كاشانَ أنا

مهنتي الرسمُ

أصنع أحياناً قفصاً بالأصباغ، أبيعه لكم

ليُمتع قلبكم

بأغاني الشقائق المحبوسة فيه

أيُّ خيال، أيُّ خيال،...أعلمُ

أنَّ لوحتي لا روح لها.

أعلمُ جيداً أن حوض لوحتي خالٍ من الأسماك.

تركيب الشعر والرسم في روح سهراب سپهري المنعزلة والتواقة إلى نوع من العرفان الحديث يُكسب شعره شفافية الإحساس والدقة والفنية، وأيضاً يكسب لوحاته نوعاً من الإخلاص الشعري.

يبتدئ ديوان "الحجم الأخضر" بشعر "رسالة الأسماك" فتفتقد أشعاره طبيعتها الواقعية وتنحو نحو السريالية. لكن فضاءه السريالي يفتقد لأي قيمة رمزية، وينطوي على وجود روح كلية في الأشياء والطبيعة ودوران تناسخي فيها. فهو في هذه المجموعة صاحب حس عال تكتسي فيه مدينته الفاضلة شكلاً ذهنياً..

إذن من أهم مميزات شعر سهراب : الخيال اللامحدود، و نوع من السريالية الأنيقة، والبحث عن الصلات بين الأشياء والمفاهيم من منظار شاعري ممزوج بالخيال.

رحلات سهراب إلى الغرب والشرق وزيارته روما وأثينا وباريس والقاهرة وتاج محل وآغره وطوكيو تعتبر سلوكاً روحياً، تأمل فيه سهراب في الأرواح والأنفس، أكثر ممّا جاب فيه العالم.

قبل أن يقصد سهراب الهند واليابان كان يألف التفكير البوذي والسلامة العرفانية للقدماء، فقد أدت هذه الرحلة إلى تعميق الفتنة ورغبته. وفي الأخير أكسبت فنّه مساراً عرفانياً ومتطهراً.

وقد أكسبته رحلته إلى اليابان التي كانت بهدف تعلّم النحت على الخشب أشياء أخرى. إذ نرى أجواء قصائده تشبه أجواء شعر "الهايكو" الياباني.

و إذا ما كان سهراب راضياً بموروثه وممتلكاته، وإذا كان ملتزماً بمحيطه ومدينته، فهذا من تأثير هذه الرحلات.

ونزعة سهراب إلى الطبيعة بارزة بوضوح في شعره ورسومه، لأنه أقبل على الطبيعة في حياته، وتجنّب من حوله، هؤلاء الذين ربما يمتلك القليل منهم الصفاء والنقاء الإنساني الأمثل :

به سراغ من اگر می آیید،

نرم و آهسته بیایید، مبادا که ترك بردارد

چینی نازك تنهایی من .(٧)

الترجمة :

إذا جئتموني،

فتعالوا بلطف و هدوء

مخافة أن تنفطر زجاجة وحدتي الرقيقة.

رغبة سهراب بفن ومدارس الشرق الأقصى الفنية والفكرية شيء واضح، وقد واكب هذه الرغبة بوعي من خلال ولعه بالبحث والدراسة في الفلسفة والأديان، كما عُرف عنه في الخمسينيات بأنه رسام متجدد. مع أنه قد ابتدأ كتابة الشعر في نفس هذه الفترة. صدر ديوانه الأول "موت اللون" في عام 1951م، وفي عام 1953م صدرت مجموعته الثانية تحت عنوان "حياة الأحلام". وأصدر عام 1961م مجموعتين هما "أنقاض الشمس" و"شرق الحزن". في هذه المجاميع كان واضحاً صدى تأثيرات "نيما يوشيج" رائد الشعر الفارسي الحديث، لكن في مجموعاته الأخرى "وقع قدم الماء" و "المسافر" وخاصة في "الحجم الأخضر" لا نسمع صوته المألوف، وقد رأى البعض في آخر قصائد سهراب تشابهاً بلغة "فروغ فرخ زاد" (٧)الفكرية.

طُبعت دواوين سهراب عام 1978م في مجموعة واحدة، إضافة إلى ديوان لم يصدرْ من قبل بعنوان "نحن لاشيء، نحن نظرة" تحت عنوان "الأسفار الثمانية".

لقد لاقى شعره في أوائل عهده الرفض والانتقاد، وذمَّ الشعراء النقاد التقليديون شعره وأسلوبه، ووصفوه بأنه إنسان سلبي وغير مسئول ومنصرف عن المجتمع والناس. لكن سهراب استمر بإبداعه بعيداً عن هذا الصخب.

كان سهراب لا يعبأ بأحكام الآخرين، كان يعلم بأن زماناً سيأتي يحظى فيه شعره بالقبول العام، فعمل في هدوئه، ووهب ما أدركه بالإشراق الفني للوحاته، وإلى كلماته الرقيقة كالماء واللطيفة كزرقة السماء.

أبرز خصوصية في شعر سهراب هو امتلاؤه بجوهر الشعر. وفي ذلك ميزة قلما يكتسبها الشعراء بمثل ما اكتسبها هذا الشاعر.

شعر سهراب مع كونه مجرد من الأوزان العروضية والقافية و الرديف،(٨) إذ يعتبر أول شاعر إيراني قام بكسر أوزان العروض القديمة للشعر الفارسي الكلاسيكي و القائم

موسيقى داخلية. فهو يخلق-باستخدامه الأصوات والكلمات- موسيقى لطيفة، تجعل قصائده متميزة عن قصائد الآخرين، وهذا الجانب يعيّن قواعد أسلوبه المتميز.

إن ترابط الكلمات وتجانس الصور تظهر في أعماله بشكل بديع وصاف، وقبل أن تكون هذه الصور قابلة للإدراك في الطبيعة، تُدرك في ذهن القارئ ووجدانه، وتمتزج مع إدراكه الإنساني :

آب را گل نكنيم :

در فرودست انكار، كفترى مى خورد آب.

يا كه در بيشه دور، سيره اى پر مى شويد.

يا در آبادى، كوزه اى پر مى گردد.

آب را گل نكنيم :

شايد اين آب روان مى رود پاى سپيدارى، تا فرو شويد اندوه دلى.

دست درويشى شايد، نان خشكيده فرو برده در آب.(٩)

الترجمة :

لا نُعكّر الماء :

لعلَّ حمامةً في المنحدر تشرب الماء.

أو في الأجمة البعيدة طيراً يغسل جناحيْه.

أو في قريةٍ جرّةٌ تمتلئ ماءً.

لا نُعكّر الماء :

ربما ينساب هذا الماء إلى صفصافة

كي يغسل حزنَ قلبٍ

ربما غَمَسَتْ يدُ درويشٍ كِسْرةَ خُبزٍ يابسة فيه..

كان سهراب سپهري-في زحام شعراء ما قبل الثورة-شاعراً فذّاً، منعزلا عن صخب المثقفين المتغربين، ويعد الآن المثل الأعلى للفنان الحقيقي، فهو شاعر يستند على قدراته ومواهبه الذاتية، عاش وحيداً وابتعد كل البعد عن المكر والنفاق والتحايل. كان يمتلك كلما يمتلكه الفنان الأصيل من فضائل.

توفي سنة 1980م إثر ابتلائه بسرطان الدم، ودفن في مدينة "كاشان".

توفي سنة 1980م إثر ابتلائه بسرطان الدم، ودفن في مدينة "كاشان".

اخترنا منظومته "نشانی" (عنوان) لترجمتها وتحليلها بغية تعرف القارئ العربي المتذوق على أبعاد شخصيته وطبيعة شعره المتجدد :

نشانی

"خانه دوست کجاست ؟"

در فلق بود که پرسید سوار،

آسمان مکثی کرد.

رهگذر شاخه نوری که به لب داشت به تاریکی شن ها بخشید

و به انگشت نشان داد سپیداری و گفت :

"نرسیده به درخت،

کوچه باغی است که از خواب خدا سبزتر است

و در آن عشق به اندازه ی پرهای صداقت آبی است.

می روی تا ته آن کوچه که از پشت بلوغ، سر به در می آرد،

پس به سمت گل تنهایی می پیچی،

دو قدم مانده به گل،

پای فوّاره ای جاوید اساطیر زمین می مانی

و ترا ترسی شفاف فرا می گیرد.

در صمیمیّت سیّال فضا، خش خشی می شنوی

کودکی می بینی

رفته از کاج بلندی بالا، جوجه بردارد از لانه نور

و از او می پرسی

خانه دوست کجاست".(۱۰)

الترجمة :

عنوان

"أين بيت الصديق ؟"

وَهَبَ العابرُ ظُلمة الرمال غُصْنَ النّوْر المُتَدَلّي من شفاهه،
و أشار بأصبعه إلى صَفْصافةٍ و قال :
"قبل أن تصل الشجرةَ
هناك زقاق مُشَجَّر،
أكثرُ اخضراراً من حلم الله
فيه الحُبُّ أزرق
بلون زَغَبِ الصَّفَاء.
تذهب إلى نهاية الزّقاق، الذي ينتهي عند خلف البُلوغ،
ثم تُدْلِف إلى جانب وردة العُزلة،
و قبل أن تصل الوردة بقدَمَيْن،
تَمْكُثُ عند نافورة أساطير الأرض الخالدة
ستأخذكَ رَهْبةٌ شَفّافة.
ستسْمَعُ في صفاء الفضاء السَّيال
خرخشة،
سترى طفلاً
تسلّق صَنَوْبَرَة سامِقة
كي يقتطف من عُشّ النّوْر فرْخاً،
اسأله :
"أين بيت الصديق ؟"

شعر "عنوان" هو عبارة عن أسطورة، أسطورة البحث عن الصديق، أسطورة هوية الصديق. وليس المهم الصديق الذي حُدّد عنوانُه، لكن المهم هو الطريق الذي يُقطع في طلبه. هذا الزقاق الأسطوري الذي افتُرش للفارس ليصل إلى "الصديق" هو الأهم، وليس الصديق نفسه الذي يقبع خلف الحجب. ومن هذا الحيث فإننا نلمس في قطعة "عنوان" مشابهة لقطعة "العلاقات" للشاعر الفرنسي "بودلير" التي يشبّه فيها الطبيعة بمعبد تُسمع باستمرار من أعمدته أصواتٌ تحوّل العالمَ إلى عالم من العلائم.

"عنوان" مشابهة لقطعة "العلاقات" للشاعر الفرنسي "بودلير" التي يشبّه فيها الطبيعة بمعبد تُسمع باستمرار من أعمدته أصواتٌ تحوّل العالمَ إلى عالم من العلائم.

السعي للوصول إلى الصديق هو مصير الباحث، ويبدو أن الباحث يعيش في بحث وتنقيب عن النصيب الأبدي. لعل هذا الصديق لا يحظى بالأهمية التي تحظى بها إشاراته وعنوانه المعروف والمجهول في آن واحد. الصداقة التي ترفل في حجب الطبيعة بعيداً عن أنظارنا هي الأهم. هذه الإشارات بمثابة أضواء تنير لنا نحن الباحثين الأرض الموعودة وأين يكمن الجبل والهضبة والأرض غير المعبدة، هذه الأخيرة عبارة عن سطح صاف ومصقول تملأ أطرافها أضواء تدعونا للتأمل والنزول والرؤية والتجربة.

من يكون هذا "الفارس" الذي يبحث عن عنوان الصديق ؟ الصور والاستعارات الواردة في النص تشير إلى أنه لا يمكن أن يكون شيخاً أو عجوزاً، بل إنه فتى لم يصل بعد إلى سن البلوغ أو فتاة في كامل رعونتها وحسنها قررت البحث عن حاجتها الروحية فخلّفت الدنيا وراء ظهرها وانطلقت في رحلة البحث عن الصديق. كما أن هذا الفارس يجب أن يكون ممتطياً فرساً أبيضاً وقوياً متحكماً في لجامه. ألا يدعونا سهراب سپهري إلى شرافة اللون الأبيض ؟ لأن كل شيء أبيض ونوراني، والفرس كذلك.

كل أسطورة تنطوي على عدة رموز. "بيت الصديق" يرمز إلى الأرض الموعودة. البيت يعد بالراحة والنوم والدعة، وهو وسيلة للخلاص من التيه والضياع، والصديق في مفهوم الصوفية هو المعبود، وفي منطق العشّاق هو المحبوب، وفي اصطلاح الأصحاب هو الصديق والصاحب. "الفجر" يرمز إلى البياض حيث مكمن النور والصفاء والطهر. والسؤال يدل على عدم الإطلاع وعلى البحث والتطلع وعلى الألم والحاجة. حينما "تتمهل السماء" فإنها تهيئ الأرضية لنشر السر وإشاعة النور. "يد العابر" هي عبارة عن مفتاح للعثور على بيت الصديق. "العابر" هو المرشد أو شيخ الطريقة ينقذ الأسرار من الظلمة ويبثها في أسماع الفتى المريد.

سپهري لا يقف على النار-مثل "دانتي"- بل يسرع نحو الصديق وسط ذاك الزقاق المشجر الفردوسي بين إشارات وعلامات الجنة. "غصن النور" يرمز إلى النور نفسه في تأكيد لمضمون النور في الشعر. يوهب "غصن النور" إلى الظلمة. "الصفصافة"

في هذا الزقاق حيث الصفاء والصدق لا نستبعد أن يكون العشق "أزرقاً" وأن تستبدل الصداقة بطائر محلق. أليس الطائر رمزاً للصدق والصفاء ؟ فمن حق سهراب وهو الشاعر الرسام أن يرى العشق أزرقاً. "البلوغ" هو بلوغ معنوي وفكري وهو في نفس الوقت بلوغ جنسي. "وردة العزلة" أو "وردة الوحدة" تشير إلى منتهى الجمال، ولأنه يجب قصدها، فوردة العزلة اسمٌ لزقاق يصلح أن يكون سكناً في عرف الصوفية. الورد نفسه يستلزم وجود "نافورة"، نافورة ماء، ماء الأرض، و"أرض الأساطير" مرتبطة بالماء والورد والوحدة أو العزلة. ورد العزلة قد يعني فيما يعني ورد الإشراق وورد الخلوة المعنوية والروحية. "الرهبة الشفافة" رهبة عرفانية صوفية ونيّرة تدل مسير البحث وعلى وجود سر ينبغي إفشاؤه.

في هذه الدنيا المجردة من كل شيء سوى الزقاق المشجر والصفاء السيّال الذي يسكن الذهن. و"السيّال" صفة تصويرية تدل على الصفاء الذي غمر كل شيء وانساب في كل مكان. و"الطفل" يرمز إلى روح الصفاء وجوهر البحث والخيال وأصالة الطهر. "صنوبرة سامقة" تشير إلى الروح المتعالية للطفل وعظمة تخيله البسيط. "أخذُ الفرخ" هو عمل ملازمٌ للطفل، لكن لماذا من "عش النور" ؟ لأن الطفل المتطلع يعيش في الظلمة، ولكي يعرف معنى النور، يجب أن يقتطف الفرخ من عش النور. النور هو عرفان وإشراق في نفس الآن.

رغم أن "الفارس" وصل إلى الطفل المتسلق الشجرة وعثر على عنوان النور -وقد يكون الصديق هو ذاك النور- لكن العابر يطلب منه استفسار الطفل : "أين بيت الصديق ؟" طرح هذا السؤال مجدداً له جانب تمثيلي يكمل رمزية الشعر. يعني أن العابر يقول له عليك السؤال دوماً، حتى ولو رأيت النور، الذي قد يكون هو بيت الصديق، يجب أن تبقى دوماً في بحث عنه، وتقطع كل الأودية وتتخطى كل العلائم والإشارات، لا مجال للارتواء في هذا الطريق، ينبغي طلب العطش حتى تتفجر عليك المياه من فرق ومن تحت. حتى المسحة الصوفية التي نلفيها في نهاية هذا الشعر مشحونة ومفعمة بالصفاء الشعري.

تحت. حتى المسحة الصوفية التي نلفيها في نهاية هذا الشعر مشحونة ومفعمة بالصفاء الشعري.

المراجع :

1/ سهراب سپهري،"صداى پاى آب" (وقع قدم الماء) مختارات شعرية، مؤسسة انتشارات نگاه، طهران، 1994م.

2/ محمد جعفر ياحقي، "جوبيار لحظة ها" (جدول اللحظات)، منشورات جامي، الطبعة السادسة، عام 2004م.

3/ إسماعيل حاكمي والا، "تاريخ اديبات معاصر" (تاريخ الأدب المعاصر)، منشورات "أساطير" الطبعة الثانية، عام 1374 هش.

5/ منوجهر أكبري ، "نقد وتحليل ادبيات انقلاب إسلامي" (نقد و تحليل أدب الثورة الاسلامية)، منظمة أسناد الثقافة للثورة الإسلامية، الطبعة الأولى، عام 1992م.

6/ قيصر أمين بور، ، "سنت ونوآوري در شعر معاصر" (الأصالة و التجديد في الشعر المعاصر)، منشورات علمية-ثقافية، الطبعة الأولى، عام 2004م.

7/ سيد مهدى زرقانى، "چشم انداز شعر معاصر ايران" (نظرة إلى الشعر المعاصر الإيراني)، دار النشر "ثالث"، الطبعة الثانية، 1384 هش.

حوا لهـ جات

(١) الدكتور سيد مهدى زرقانى، جشم *انداز شعر معاصر ايران* (نظرة إلى الشعر الإيراني المعاصر)، ص

(٢) الدكتور جعفر ياحقي، *جويبار لحظة ها* (جدول اللحظات)، منشورات جامي، ص 8.

(٣) الدكتور إسماعيل حاكمي والا، *تاريخ أدبيات معاصر* (تاريخ الأدب المعاصر)، ص2.

(٤) الدكتور جعفر ياحقي، *جويبار لحظة ها* ، ص 9-11. وللمزيد من المعلومات راجع : *ادبيات معاصر ايران*، للدكتور محمد رضا روزبه.

(٥) "صداى پاى آب" (وقع قدم الماء) مختارات شعرية لسهراب سپهري، ص : 158.

(٦) "حجم سبز" (الحجم الأخضر) مختارات شعرية لسهراب سپهري، ص : 232.

(٧) شاعرة إيرانية معاصرة، كرست شعرها لمعاناتها الروحية. ولدت في طهران سنة 1934م. و هي اسمٌ متميز في ديوان الشعر الفارسي المعاصر. توفيت سنة 1967م. صدر لها العديد من المجموعات الشعرية.

(٨) الرديف في الشعر الفارسي-وخاصة الكلاسيكي منه- هو عبارة عن كلمة أو عبارة تتكرر بعينها في نهاية كل بيت من أبيات الغزلية.

(٩) "حجم سبز" (الحجم الأخضر) مختارات شعرية لسهراب سپهري، ص : 211.

(١٠) "حجم سبز" (الحجم الأخضر)، ص :242.

*****

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 167 - 174

مجلہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۷۶

شہادت خان لکھیرا: پنجاب دا اِک نشا بھر پاتر

ڈاکٹر سعید بھٹا ☆

Abstract:

Shahadat Khan Lakhera was an eminent figure of the seventeenth century Punjab. Significant data about him is available in the Folk Literature. It is a distinction of Folk Literature that only those names survive in it it which are closest to the hearts of the people. Lakhera is the representative of the seventeenth century cultural and moral values of the Punjab. He was the model of the great Punabi values, like resisting the cruel, challenging cruelty, acknowledging the velour of the enemy, not being rude to anyone and confronting the mightiest ruler in the defence of someone who has been promised protection. The writer has called him very rich in these sublime moral values which show life at its zenith. Such are the times when great personalities are born. The thesis opens with the introduction of this very important character on a high note.

ہر جی اپنے وسیب دا جم پل ہوندا ہے۔ اوہدے جیون اُتے وسیب دے گھنے پرچھاویں ہوندے ہن۔ وسیب دے پکے پیریں کھلوون پچھے صدیاں دا پینڈا ہوندا ہے۔ تے اوہدے مگروں اوہ چنگ مند دے پیمانے بناوندا ہے۔ نِرا ایس چنگ مند دے کنڈے

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ پنجابی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اُتے تُلن نال تاں ہک ریتل پاتر بندا ہے، جیہڑا رِیتاں نُوں انھے واہ جپھا پائی رکھدا ہے۔ سُچا پاتر اوہ ہوندا ہے، جیہڑا اپنے وسیب وچ ڈُبیا ہوندا ہے تے وت لوکائی دیاں منگاں اُتے پُورا لہندا ہے۔ اوہ اپنے وسیبی ہنڈھیے وچوں کجھ سٹے کڈھدا ہے جیں پاروں اوہدی نویکلتا جمدی ہے۔ وت ایہہ سچّا (ماڈل) کئی پیڑھیاں کان نمونے دا کم دیندا ہے۔ اصل وچ ایہہ جیون دیاں سدیویاں قدراں ای ہوندیاں ہن، جیہناں دی چون اوہنوں امر کریندی ہے۔

ستارھویں صدی دا پنجاب اپنی وسیبی امیری پکھوں بہوں گُن ونتا ہے کہ ایہدے وچ عاشق تے وریام، شاعر تے سوجھوان سبھے اپنا رنگ جمائی بیٹھے ہن۔ ایس ڈھانی دا ہک اگوان شہادت خان لکھیرا وی ہے۔ لکھیرے نُوں پچھلیاں صدیاں دے لوک ادب نے رج ستکاریا ہے، پر اجوکیاں پیڑھیاں کان تاں اُکا ای اوپرا ہے۔ لوک ادب وچ کمالیے دے جیں کھرل نُوں شہادت خان آکھیا گیا ہے۔ اورنگ زیب دے ایس سمکالی پاتر بارے انگریزی اُردو لکھتاں وِچ سعادت یار خان دے ناں نال ویروا مِلدا ہے۔ ''دی پنجاب چیفس'' موجب سولھویں صدی وچ کمالیہ وساون والے کمال خان کھرل دی چوتھی پیڑھی سعادت یار خان دا ناں آوندا ہے۔(۱) ''گزٹیر آف دی چناب کالونی'' وِچ لکھیا ہے۔

"The lakhera clan was never numerically strong but it attained a certain amount of importance in the reign of Alamgir, when Saadat Yar Khan, the chief of Kamalia, obtained a jagir from the Delhi Emperor." (2)

پروفیسر قاضی فضل حق ہورراں چنابی دے قصہ ''ہیر و رانجھا'' دی پڑچول سمے کمالیے دے اودو کے رئیس خان بہادر سعادت علی خان ہوراں نُوں چٹھی لکھی تاں اوہناں ولدا دِتا:

''سعادت یار خان بھی اپنے باپ کی طرح جامع دوصفت رئیس و فاضل تھا۔ اور اسکی علمی قابلیت اور سخاوت کے بے شمار افسانے زبان زد خلائق ہیں۔ کثرت سخاوت کی وجہ سے وہ ''سخی'' کے لقب سے ملقب ہے۔ نہایت وجیہ اور تن آور تھا۔ مشہور ہے کہ ایک

دفعہ بادشاہ نے خلعت دینا چاہا۔ دو تین خلعت منگائے مگر کوئی اُس کے قد پر پورا نہ اُترا۔ اُس وقت اُس نے حافظ کا یہ شعر پڑھا:

ہرچہ ہست از قیامت ناساز و بی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالای کس کوتاہ نیست''

(۳)

اُتلے وچاراں توں سہج سبھا سِٹا نِکلدا ہے کہ عالمگیری سمے دا پاتر سعادت یار خان لوک بولی وچ شہادت خان دے ناں نال مشہور ہویا۔

ہک لوک کہانی وچ دسیا گیا ہے کہ شہادت خان راوی تے چھاں دے راٹھاں وِچوں وڈا کیہڑا ہے، دا نروار کرنا چاہوندا ہے۔ کوئی اجیہا موقع نہیں بندا کہ اوہ نکھیڑا کر سکے۔ اوڑک اوہ راوی چھاں دے راٹھاں سردار شاہ شہابل، مراد ولا راء، واہند آسی تے نارنگ ساہی نُوں وزیراں تے چونویں فوج سنے دریا وِچ بیڑی تے سیر کراوندا ہے۔ اوہ دریا دی آدھی وچ مہانے نُوں بیڑی بوڑن دا حُکم دیندا ہے تاں شاہ شہابل تلوار لے کے اوہدے سر اُتے گجدا ہے۔ کہانی کار دے لفظاں وچ:

''ارے مہانا! مینوں بچپن توں بڑا شوق ہے۔ میں بیڑی بُڈدی نہیں ڈِٹھی۔ کس طرح غرق ہوندی ہے۔ چپا پھیر تے بیڑی غرق کر دے۔ مودھی ہو جاوے''۔ ترائے راٹھ کول بیٹھن۔ وزیر، مشیر، سردار صاحب اگے بیٹھن۔ بیڑی پار جاندی پئی ہے۔ تریئی ویری نواب صاحب آہدن: میں تینوں بحیثیت نواب دے حُکم کرناں۔ اوہ بُلا را شاہ شہابل دے کناں تے جا پیا۔ اوتھوں بیٹھیاں جوں ماریا نا دھرک نواب شہادت خان دے سر اُتے شاہ شہابل آن لتھا۔ تلوار میان چوں باہر ہے۔ سردار صاحب بُلایا۔ ''ارے مہانا!'' ''عالی جاہ!'' ایس بیڑے نُوں حُکم اللہ دے نال کدھی نال چاں لا''(۴)

شہادت خان لوکائی نُوں ایہو دسنا چاہوندا ہے کہ جیہڑا ظالم دے ظلم نُوں ڈکدا ہے، اوہی وڈا ہے۔ ایہی پنجاب دی صدیاں بدھی رِیت ہے۔ ایس ریت انیائیاں نُوں ٹھلھن والیاں نُوں ای وڈپ دِتا ہے۔

نورے چدھڑ دا پیو سلیما کسے لڑائی وِچ شہادت خان لکھیرے دی تلوار نال پھڑ ہوندا ہے۔ نورا چنھاں توں ہکلا مکلا کمالیے شہادت خان دے ڈیرے اُتے جا پُجدا ہے۔ نُورا اوہنوں للکر یندا ہے تاں شہادت خان لکھیرا اوہدے اگے سِر نیواں کر دیندا ہے۔

''آ کھیا ہے شہادت خان، ''بچڑا بُھل کے نُونہہ آیا۔ تلوار واقعی میں ہی ماری ہائی چودھری سلیم نُوں۔ امر ربی اِنجیں ہائی۔ میری تلوار نال اوس مرنا ہائی لیکن بندہ کجاک ہائی۔ مر گیا۔ تُوں آ گیا ہیں''۔ اوس سِر نوایا، ''لے جا سر میرا۔ لاہ لا''۔ جیس ایلے سر نوایا شہادت خان۔ ''بس چاچا ویر مُک گیا ہے۔ میں گھر پیا جانا ہاں''۔(۵)

نورا چنھاں دا راٹھ ہے تے شہادت خان کمالیے دا نواب۔ شہادت خان دی کچہریوں نورے دا جیوندیاں پرتنا محال ہے۔ نورا بھاویں اوہدا ویری ہے پر شہادت خان اوہدی بہادری نُوں سلا ہوندا ہے۔ انج بہادر بھاویں دُشمن وی ہووے، پر اوہدے گُن نُوں وڈیاونا بار دیاں قدراں دا حصہ ہے۔ شہادت خان اپنے ایس عمل نال جتھے دشمن نُوں سجن بنالیندا ہے اوتھے آون والیاں نسلاں کان جیوندی جاگدی مثال چھڈ ویندا ہے۔

چدھڑاں دی آپسی زمین دی ونڈ دا جھیڑا مغل نواب دی کچہری وچ جھیڑ یندا ہے۔ نورے دا چاچا سلطان سفارش کان شہادت خان کول جاوندا ہے۔ شہادت خان آ کھدا ہے۔

''اوہ وی ترا ہے گھر تساں جیہے اُمید آلے ہین۔ میتھوں بے حیائی تے بے ملاحظی

نہیں ہوندی''۔ سلطان چُپ کر گیا۔ سیت ہک ہوئی تاں شہادت خان آ کھیا،''سلطان مونہہ بھیڑا نہ کر جیہڑا تساں سلیمے کا مطلب ہے خط اچ پُورا ہو ویسی''۔ (۶)

کسے دِھر دی بدلحاظی نہ کرنی تے سجن دا کم انج کرنا دُوئے کن نُوں پتہ وی نہ لگے۔ ایہہ اوہ قدراں ہن جیہناں نُوں پنجاب دے ساؤ سبھاواں ہمیش وڈیائیا ہے۔ دُوجے بنے ہو چھاپن ہوندا ہے جیہڑے سجن دی اوکھے ویلے دھڑ کر کے پے ڈھول مریندے ہن۔ انج دے جی کدی لوکائی دے من وچ تھاں نہیں بنا سکدے۔

دُنیا دے اقداری نظاماں وچ پناہ دیون نُوں ہمیش سراہیا گیا ہے۔ جے کسے پناہی دے ویری تگڑے ہن تے تاں انج پناہ دے کے پرایا ویرا اپنے گل گھتن والی گل ہوندی ہے۔ اساڈے وسیب پرائی اگ وچ دُھکھن دے ایس عمل نُوں چنگیاں جانیا ہے۔ پنجاب دی وسیبی تاریخ وی انج دے بھلیاں نال بھری پئی ہے۔ دارا شکوہ تے اورنگ زیب دی تخت نشینی دی جنگ وچ داراشکوہ نُوں بھاج آوندی ہے۔ اوہ جان بچاون دی خاطر شہادت خان کول کمالیے پناہ لیندا ہے۔ شہادت خان ویکھ رہیا ہے کہ اورنگ زیب ہُن ہند دا بادشاہ ہے تے داراشکوہ نُوں پناہ دیونی بادشاہ نال ٹکر لین والی گل ہے۔لوک کہانی موجب شہادت خان نُوں گرفتار کر کے اورنگ زیب دے دربار وچ پیش کیتا جاندا ہے:

''کیوں لکھیریا تیرے کول گیا دارا؟'' اکھے،''گیا''۔ اوس کیہ آ کھیا،''اوس آ کھیا، میں سائل ہو کے آیا ہاں۔ بھکھیا منگنا ہاں اپنی جان دا جے پیش جاں کریں تاں انعام لے لے۔ تے رب دا ناں منیں تاں مینوں بہا لے''۔''توہیں کیہ آ کھیا؟'' میں آ کھیا، میرے واسطے توں انجیں ہیں جیویں تخت تے بیٹھا ہویا ہیں۔ بادشاہ نال میں مقابلہ نہیں کر سکدا پر لکھیری دے جمے ہوئے تیری لت ہیٹھ نہ کوہائیں تاں مینوں لکھیرے دا خون

نہ آکھیں''۔ ایہہ سگویں لفظ اگے دربار وچ دارا سُنا چکا ہا۔ بادشاہ آکھیا، ایہہ کوڑ کیوں مریوئی۔ توہیں کوئی انج کرنا ہا جے میں دھا کے آواں ہا؟ اوس آکھیا، شہنشاہ سلامت! توہیں ہر بندہ حرامدا سمجھیا ہویا ہے۔ایس پنیے بلوچ روک۔ ایس توں نہ جوں بھار چیندا تاں اگانہہ تاں جاون دیندا۔ کدی مہمان وی کسے حلالی پھدھ کے پیش کیتن''۔(۷)

پنجابی لوک کہانی موجب دارا نس کے قندھار اپڑنا چاہوندا ہے۔ اوہ بلوچستان دے پنیے بلوچ جیون خان کول جاوندا ہے تاں جو اوہنوں قندھار اپڑائے۔ دارے دی قندھار اپڑن دی سِک دا ہنگارا تاں تاریخاں وی بھردیاں ہن، پر دارے نُوں دھوکھے نال گرفتار کراون والا ملک جیون خان پٹھان سی۔ برنیئر دے لفظاں وِچ:

"While Dara's mind was in this state of perplexity and indecsion, it occured to him that he was at no considerable distance from Gion Khan, a Patan of some power and note, whose life he had been twice the means of preserring, when condemmed by Chah-Jehan to be thrown under the elephant's feet, as a punishment for various acts of rebellion." (8)

برنیئر دا وچار ٹھیک جاپدا ہے کہ قندھار پٹھاناں دی جُوہ دے لاگے ہے تے ایس گل دا ہنگارا تاریخاں وی بھردیاں ہن کہ جیون خان پٹھان ای دارے نُوں وساہ کے اورنگ زیب نُوں خبرایا ہا۔ لوک کہانی وچ آون والے انج دے بھلیکھیاں نُوں نہ نتاریے تاں ایس وچوں ایہو درس ملدا ہے کہ ہمتالاں دے مقابلے تے پناہ دیونی جیون دی وڈی قدر ہے۔

اصل وچ انگریزی راج توں پہلاں دا پنجاب، علم ، تاریخ، ادب، کومل کلا، وسیبی امیری تے جیون دے دوجے کھیتراں پکھوں اُونا ناہی۔ اودوں پنجابی وسیب اپنے پیراں

تے کھلوتا ہا، جیہدے سٹے وچ ایہدا اپنا اقداری نظام جمیا۔ ایہدے جیون دیاں قدراں وڈے توں وڈے اخلاقی نظاماں دے ساویں لہندیاں ہن۔ اودوکے جیون وچ کِنے ای شہادت خان ہائن جیہناں دے سُچّے جیون نُوں لوکائی ماندی ہا۔ لوک ادب وی شہادت خان ورگے پاتراں نُوں ای مانتا دیندا ہے، جیہڑے بندیائی دا پکھ پُوردے ہن۔ انج لوک پریت انجیہے پاتراں نُوں سدیوی حیاتی بخشدی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

1. Sir Lepel H.Griffin, The Punjab Chiefs, ed. Colonel Charles Francis Massy, Rev. ed 1st, W.L.Conran, H.D.Craick, Rev.ed 2nd (Lahore: Sang-e-Meel,2004) 229.

2. Punjab Government, Gazetteer of the Chenab Colony, (Lahore: Civil And Military Gazette, 1905)16.

3۔ پروفیسر قاضی فضل حق مرحوم۔''عشقیہ پنجاب یا قصہ ہیر و ماہی'' پنجابی قصے فارسی زبان میں جلد اول۔مرتب۔دکتر محمد باقر (لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، 1957ء) 119۔

4۔ پروفیسر سعید بھٹا،''شہادت خان لکھیرا،'' پنجابی ادب 72-18.71 (2004ء) 65-64۔

5۔سعید بُھٹا،''نور سلیمے دا چدھرڑ،'' پنچم 2-5.1 (2003ء) 66۔

6۔سعید بھٹا، مرتب۔ دیس دیاں واراں پہلی جلد (لاہور: پنجاب انسٹی ٹیوٹ لینگویج آرٹ اینڈ کلچر، 2007ء) 43۔

7۔سعید بھٹا، مرتب۔ کمال کہانی (لاہور: سانجھ، 2006ء) 102۔

8 Francois Bernier, Travels in the Mogul Empire, tran, Irving Brock (London: Westminster, 1841) 95.

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 30, Sr.No.76, 2009, pp 03 – 18

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۰، جولایی - ستمبر،
شمارہ ۷۶، ۲۰۰۹ء

Arthur John Arberry as an Interpreter of the Holy Qur'an

*Dr. Sultan Shah

Abstract:

The Holy Qur'an has been translated by many scholars both Muslims and orientalists. Alexander Ross was the first among the Western scholars who published his English translation in 1649.Afterwards,George Sale,J.M.Rodwell, E.H.Palmer ,Richard Bell, A.J.Arberry and others rendered the Islamic Scripture into English. Among these translators, Arberry figures unique as he is considered as an honest scholar. He devoted a lot of time to comprehend the Holy Qur'an and then to present its English version. He published "The Holy Qur'an: An Introduction with Selection" succeeded by his complete translation entitled "The Koran Interpreted." An attempt has been made to highlight some merits and demerits of Arberry's translation. Some of his shortcomings have been pointed out by comparing with the translations of Muhammad Marmaduke Pickthall, 'Abdullah Yusuf 'Ali and Muhammad Asad .His translation has been regarded as the best among the renderings of the Qur'an published by orientalists.

Arthur John Arberry (1905—69) was a most prolific scholar of Arabic, Persian,and Islamic Studies. He was educated at Portsmouth Grammar School and Pembroke College, Cambridge. He spent several years in the Middle East perfecting his Arabic and Persian language skills. For two years (1932-34), he served as

* Post Doc Fellow, University of Glasgow, UK

Head of the Department of Classics at Cairo University in Egypt. In 1934, he returned home to become the Assistant Librarian at the Library of the India Office, a post recently vacated by C.A. Storey. Cambridge University awarded him the degree of Litt.D. in 1936. On September 1,1939(during World War II), he was transferred to another Civil Service department, to the War Office's Postal Censorship Department in Liverpool and, six months later, to the Ministry of Information, London. In 1944, Arberry was appointed to the Professorship of Persian at the School of Oriental and African Studies, University of London. After two years, he was elected as Professor of Arabic and Head of the Near and Middle East Department and in the following year he joined his alma mater Pembroke College, Cambridge as Sir Thomas Adam's Professor of Arabic, a post which he held for the remainder of his life. The Prolific writer and translator published 90 books, which appear under his name in the catalogue of the Cambridge **University Library, more than 70 articles in scholarly journals,** in addition to numerous reviews and contributions to encyclopaedias. [1]

Arberry wrote on different topics pertaining to oriental learning. He not only translated from Arabic and Persian literature but even rendered some poems from Iqbal's poetry into English. He wrote on Islamic mysticism, Islamic civilization and orientalism. He devoted a lot of time to comprehend the Holy Qur'an and tried to present it in English honestly .In 1953, he published "The Holy Koran:An Introduction with Selections" [2] in which he included translation of various passages of the Qur'an and small surahs

under71 titles. Gibb estimates that these selected passages amount only to one-sixth of the entire Qur'an.[3] He begins with the first surah of the Book, al-Fatihah, 'The opening prayer' in his words.[4] The first section represents the Qur'anic teachings on God, His unity, His attributes, and the evidences of His existence to be seen in nature. The second group collects together some of the personal experiences of the Prophet and offers fine examples of rhetorical artistry. The third and longest section comprises those parts which recount the experiences of earlier prophets.

In this work, Arberry seems different to (from) his predecessor translators of the Holy Qur'an. Rightly did Gibb observe: "it can be confidently said that this version offers to the English reader a much more faithful and comprehensible outline both of its ethical and religious teaching and of its literary quality than any previous translation". [5]

In the beginning, he has written an introduction in 22 pages that contains a brief review of the English Qur'anic renderings published in the West before him. He mentioned Edward William Lane, Stanely-Poole, George Sale, E.H.Palmer ,J.M.Rodwell, Marmaduke Pickthall, D.S .Margoliouth, H.A.R. Gibb, R.A. Nicholson , Carlyle. R. Blachère, Dr.J. -C. Mardus and Theodor Noldeke and tried to repudiate the wrong approach of the orientalists. Unsatisfied by the work done and methodology used by his predecessors,he deviated from their tradition with an urge that 'it is best to make a fresh beginning'[6] . He confesses to his readers that even though he was not a Muslim; his intention was to

endeavour fairly, not only philologically but also imaginatively, by making the effort always to approach and apprehend these scriptures as if he believed them to be divinely inspired.[7]

According to Rosenthal, Arberry's introduction is important for two reasons: his treatment of the style and his insistence on treating the Qur'an as the Muslim believer's inspiring Scripture.[8] The language of Holy Qur'an is allusive, rhymed, heavily charged with emotional overtones, many of which lie in its sentence structure and rhythms. Professor Arberry has acutely set himself,to analyse at least one of these aesthetic qualities; its rhythmic structure.He aimed to preserve in his translation corresponding (but not, of course, identical) English rhythmical structures.[9] The bibliography given in the end manifests that he had consulted vast literature pertaining to the Qur'an in European languages like French, German, Italian and Latin besides English.[10] Margaret Smith recognizes it a 'good bibliography of Qur'anic Literature'[11]in her review.

Later on, Arthur John Arberry translated the Holy Qur'an into English and published it under the title "The Koran Interpreted" in 1955. It was printed in two volumes; the first volume contains translation of 20 surahs and remaining 94 surahs are in the second volume.[12] Each volume has its own preface, and the second volume contains an index to the entire work. Later on, it was printed in single volume. Praising Arberry's achievement, S.A. Skilliter thinks that "The Koran Interpreted" was Arberry's master-work for which he was especially qualified".[13]

In the preface, he has traced the history of the English translations of the Holy Qur'an before him and discussed brief history of its compilation. He has mainly devoted it to the study of English translations of Sale (1734), Rodwell(1861), Palmer(1880), Bell(1937-39), Pickthall (1930), and Richard Bell (1937-9). He has referred to the contents of some surahs. He has also told about the difference in his translation and those of his predecessors. He tells his readers that 'all previous versions of the Koran, like the original text itself, having been printed as continuous prose, the rhapsodic nature of its composition has been largely lost to ear and sight; by showing the text as here presented, some faint impression may be given of its drastic impact and most moving beauty.'[14] He argued that the Qur'an should be ranked among the greatest masterpieces of mankind on the basis of his study pertaining to the intricate and richly varied rhymes. [15]He concedes the orthodox claim that the Koran (like all other literary masterpieces) is untranslatable and calls modestly and honestly his version a mere interpretation. According to Arberry, the Holy Qur'an is neither prose nor poetry, but a unique fusion of both. He has tried to compose clear and unmannered English, avoiding the 'Biblical style favoured by some of his predecessors. There is one feature of antique usage which he has retained; it is absolutely necessary, if confusion is to be avoided, to mark the distinction between the second person singular and the second person plural. He did not not add footnotes anywhere.

The author of "The Koran Interpreted" has been careful in rendering the Muslim scripture. Some examples are quoted below:

1. Arberry translated the verse 3:45 as: "And they devised, and God devised, and God is the best of devisers." [16] He avoided the rendering like 'God is the best of plotters' as translators like Maulana 'Abdul Majid Daryabadi did. [17]
2. His translation of the verse 12:24 is worth-reading that pertains to the Prophet Yusuf. "For she desired him; and he would have taken her, but he saw the proof of his Lord." [18]
3. In the verse 12:76, he showed extra care while translating '*kidna*' .His rendering 'We contrived' [19] is quite appropriate.
4. He rendered initial part of the verse 66:12 into English carefully as: "And Mary, Imran's daughter who guarded her virginity". [20]
5. Unlike some Western scholars, he never misspelled the name of the Prophet of

Islam [21], upon whom be peace and greeting.

Here it is pertinent to mention that there are minor variations on his prior published translation of selected passages of the Holy Qur'an. e.g. Compare the rendering of the first five verses of surah 96. In "The Holy Koran : An Introduction With Selections", Arberry's translation is as follows:

RECITE: In the Name of thy Lord,who created---Created Man of a clinging.

RECITE: and thy Lord is the most Generous

Who taught by the Calamus

Taught Man that he knew not. [22]

But he used 'Pen' for *Qalam* and 'blood-clot' for '*alaq* instead of 'Calamus' and 'clinging' in "The Koran Interpreted". [23] but his first rendering of *'alaq* was more appropriate. According to Dr. Maurice Bucaille and some Muslim exegetes, "something which clings" is the translation of the word *'alaq.* [24] Actually, it is an embryonic stage of human development that resembles leech [25]. Dr.Muhammad Tahir al-Qadiri had rendered *'alaq* as 'a hanging mass (clinging) like a leech' in his Qur'anic translation. [26]

There are some drawbacks in its printing. Firstly, it does not contain Arabic text because it was mainly intended for English readers.Secondly, every verse has not been numbered and the fifth consecutive verse of each Surah is numbered. It would have been more beneficial for readers if the individual division of verses have been brought out. Thirdly, the numbers mentioned against the verses are wrong.[27] Fourthly, he has not followed proper system of transliteration.Under the influence of his predecessors ,he transliterated the Qur'an as *Koran*, Al-Hijr as *el-Hijr*, Luqman as *Lokman* and Quraysh as *Koraish.* [28]

Arberry has translated the titles of some surahs in quite a different way. In the following table, these names are quoted from three translations.

Surah No.	**Arabic**	**Arberry's Rendering**	**Pickthall's Rendering**	**Asad's Rendering**
7	Al-A'raf	The Battlements	The Heights	The faculty of Discernment
25.	Al-Furqan	Salvation	The Criterion	The Standard of

				True and False
30.	Ar-Rum	The Greeks	The Romans	The Byzantines
39.	Az-Zumar	The Companies	The Troops	The Throngs
45.	Al-Jathiyah	Hobbling	Crouching	Kneeling Down
56.	Al-Waqi'ah	The Terror	The Event	That Which Must come to
59.	Al-Hashr	The Mustering	Exile	The Gathering
67.	Al-Mulk	The Kingdom	The Sovereignty	Dominion
83.	Al-Mutaffifin	The Stinters	Defrauding	Those Who Give Short pass Measure
88.	Al-Ghashiyah	The Enveloper	The Overwhelming	The Overshadowing Event
93.	Ad-Duha	The Forenoon	The Morning Hours	The Bright Morning Star
94.	Ash-Sharh	The Expanding	Solace	The Opening-up of the heart
103.	Al-'Asr	Afternoon	The Declining Day	The Flight of Time
110.	An-Nasr	Help	Triumph	Succour
111.	Al-Masad	Perish	Palm Fibre	The Twisted Strand

It is not completely free from mistakes. Some examples are quoted below:

1. He has rendered "*al-Rahman*" into "the Merciful" in *Bismillah* and "the All-merciful" in al-Fatihah. Similarly, "*al-Rahim*" has been translated into "the compassionate" and "the All-compassionate" respectively.[29] Abdullah Yusuf 'Ali has rendered these Divine names into "Most Gracious" and "Most Merciful"[30]. Muhammad Asad has used "the Most Gracious" and "the Dispenser of Grace".[31]

2. Arberry has mistranslated the last part of 4:147 as "God is All-thankful, All-knowing". [32] Its correct translation would be as under:

   "God is always responsive to gratitude, All-knowing" (Muhammad Asad [33])

   "Allah was ever Responsive, Aware" (Muhammad Marmaduke Pickthall[34])

   " It is God that recogniseth (all good), and knoweth all things" (Abdullah Yusuf 'Ali[35])

3. The translator has misunderstood "al-Nabi al-Ummi" as "the Prophet of the common folk". [36]It should be translated into "the unlettered Prophet". [37]

4. The translation of the vers10:88 is incorrect:

   Moses said, 'Our Lord, Thou hast given to Pharaoh and his Council adornment and possessions in this present life .Our Lord, let them go astray from Thy way; Our Lord, obliterate their possessions, and harden their hearts so that they do not believe till they see the painful chastisement'. [38]

   Asad has correctly and beautifully translated it as follows:

   "And Moses prayed: "O Our Sustainer! Verily, splendour and riches hast Thou vouchsafed ,in the life of this world, unto Pharaoh and his great ones—with the result, O our Sustainer, that they are leading[others]astray from Thy path! O our Sustainer! Wipe out their riches, and hardened their hearts, so that they may not attain to faith ere they see the grievous suffering [that awaits them]!"[39]

5. He could not translate correctly pronoun used in verse 12:61.His translation is as follows: They said, 'We will solicit him of our father; that we will do'. [40] Pickthall has rendered it into English as follows:

   "They said:We will try to win him from his father; that we will surely do". [41]

6. His translation of verse 67:1 is as follows: "Blessed be He in whose hand is the Kingdom." [42] He has used 'the kingdom' as equivalent of *al-mulk* that is incorrect. It has been rendered into 'sovereignty' by Pickthall [43] and 'dominion' by 'Abdullah Yusuf 'Ali [44] and Muhammad Asad. [45]

Apart from these shortcomings of Arberry's rendering,we cannot deny the fact that this scholar actually made a sincere and huge effort. He was a great scholar who tried his best to present the Holy Qur'an as he understood it. That is why; many authors of the east and west have praised his translation. Some scholars' remarks are quoted below.

A.R.Kidwai comments on this translation:

"A.J.Arberry's The Koran Interpreted no doubt stands out above the other English renderings by non-Muslims in terms of both its approach and quality". [46]

Khaleel Mohammed has assessed Arberry's English translation of the Holy Qur'an as follows:

"He rendered the Qur'an into understandable English and separated text from tradition. The translation is without prejudice

and is probably the best around. The Arberry version has earned the admiration of intellectuals worldwide and having been reprinted several times, remains the reference of choice for most academics."[47]

E.I.J. Rosenthal, who was a reader in Oriental Studies at University of Cambridge has praised the rendering of Arberry in a beautiful way. He states:

"Here again we see all the qualities of this re-creator in English of Persian and Arabic literary treasures: a superb mastery of the original tongue,a fine sense of style and great sympathy and genuine understanding. As the title implies, it is not a literal translation, but an imaginative rendering which always captures the spirit and,I am convinced, the meaning of the original Arabic."[48]

Nabia Abbott thinks that Arberry displays a masterly command of the classical Arabic and an intimate knowledge of the Qur'an itself both as a seventh century book and as the living ,vibrant and rhythmical message that is still chanted from minaret tops throughout the Muslim world .To these qualifications are added a musical ear ,poetic diction ,and a touch of mysticism—all of which combine with the above to produce an interpretation of the Qur'an that is genuine and artistic to a degree unattained by previous translators.[49]

Abraham I. Katsh observes: "Arberry's version breaks new ground .It is scholarly, accurate, and remarkably successful in recapturing the charm and the rhythm of the original text. Hence it becomes a must for the scholar and the student of Islam"[50]

Joseph A .Devenny considers that "The Koran Interpreted" is a meritorious attempt to solve a literary problem and introduces the Westerners 'sweet music' of the Qur'an .He writes:

"Out of the manifold stylistic beauty of the Koran,a gem whose loveliness is not at once compelling to the uncultivated Westerner ,Arberry has been concerned to reproduce ,not so muchrhyme itself ,as what he conceives to be the effect of Koranic rhyme .He is further concerned to render the very abruptness-of-presentation of much that is most arresting in the Glorious Koran.For both purposes he relies upon a single literary device in English ,viz., rhythm . Koranic rhyme serves, as he analyzes it, as a termination and a connection .This function he renders, generally, by translating a single Koranic verse into several successive English lines of loose rhythm rounded off by a much shorter line .The abruptness-of-presentation he conveys by corresponding variation of his loosely rhythmic English lines."[51]

Charles J. Adams calls it the most successful English translation of the Qur'an which captures much of the flavor of original Arabic in addition to representing the best of critical scholarship. [52]Andrew Christmann says that Arberry created the most frequently used and referred to translation of the twentieth century[53].Isma'il Ibrahim Nawwab considers "The Koran Interpreted(1955),a two-volume elegant version by the versatile and fair-minded scholar A.J.Arberry (d.1969),the doyen of orientalists translators of modern times". [54]

The author agrees with Nabia Abbott who considers that 'Linguistic blunders, religious bias, political overtones, and Higher Criticism are restrained or banished.' [55] Arberry's interpretation is the best translation of the Holy Qur'an into English among the English renderings by non-Muslims. It would be more useful if Professor Arberry had appended commentary or footnotes to this translation of the Qur'an. In 1967, Professor W. Montgomery Watt published "Companion to the Qur'an: Based on the Arberry translation". [56] It provides a volume of footnotes designed for use with the Arberry translation .The aim was to provide the chief background material needed to facilitate the understanding and appreciation of the Qur'an in translation. Such material falls under two heads, namely, that the concerning questions of translation, and that concerning questions of interpretation. [57] Watt has told about the period of revelation of each surah. He has also given Arabic titles of surahs. Arberry has used a simple form of transliteration of Arabic names but Watt adopted scholarly system of transliteration. If Arberry's translation is published along with Watt's exegetical notes, it would be more useful for readers. Each surah should also contain its Arabic title and all verses should be numbered properly so that researcher can consult it easily.

References

1. Skilliter,S.A.,Arthur John Arberry ,Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London,vol.33,No.2(1970)pp.364—367/Serjeant,R.B.,Professor Arthur John Arberry,Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britian and Ireland,No.1(1970)pp.96-98
2. Arberry,A.J.,The Holy Koran. An Introduction With Selections(London:George $ Unwin Ltd.,1953)pp.141
3. Gibb,H.A.R., Book Review, The Holy Koran.An Introduction with Selections,The Journal of the Theological Studies,vol.5,No.1,pp.159
4. Arberry,The Holy Koran.An Introduction with Selections,p.34
5. Gibb,Review,op cit.
6. Arberry,The Holy Koran.An Introduction with Selections,p.18
7. Ibid,p.31
8. Rosenthal,E.I.J.,Arthur J.Arberry---A Tribute,ReligiousStudies,vol.6,No.4(December,1970)p.300
9. Gibb,H.A.R., Book Review, The Holy Koran.An Introduction with Selections,The Journal of the Theological Studies,vol.5,No.1,pp.159
10. Arberry, The Holy Koran.An Introduction with Selections ,pp.138-141
11. Smith,M.,Reviews of Books, Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britian and Ireland, No.3/4(October,1953) p.176
12. The first edition of The Koran Interpreted was published by George Allen $ Unwin in 1955 in two volumes,pp.350+367
13. Skilliter,S.A.,Arthur John Arberry ,Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London,vol.33,No.2(1970)pp.365-66
14. Arberry, A.J., The Koran Interpreted(Oxford University Press,1986)introduction ,p.xii
15. Ibid,p.x
16. Ibid,p.53

17. Daryabadi,'Abdul Majid,Tafsir-ul-**Qur'an(Islamabad:Islamic Book** Foundation,n.d.)vol.2,p.189
18. Arberry, A.J., The Koran Interpreted,p.228
19. Ibid,p.234
20. Ibid,p.595
21. See introduction and the translation of Surah 47.He spelled his name as "Muhammad"ibid,pp.ix,526
22. Arberry,A.J., The Holy Koran. An Introduction With Selections,p.50
23. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted,p.651
24. **Bucaille ,M.,The Bible,The Qur'an and Science (Indianapolis:North American Trust Publication, 1979) p.204**
25. **For detail please see.Shah,M.S. ,Stages of human in vivo development as revealed by the Qur'an, Al-Adwa'(Lahore :University of the Punjab) vol.xi,no. 16 (Decemder,2001) pp.1-14**
26. Tahir-ul-Qadri,Dr.Muhammad,Irfan-ul-Qur'an(London:Minhaj-ul-Quran International,2006)p.1043
27. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted,p.53
28. Ibid,p. v-viii
29. Ibid,p.1
30. Yusuf 'Ali,A.,The Holy Qur'an---Text,Translation and Commentary(Maryland:Amana Corpration,1983)p.14
31. Muhammad Asad,The Message of the Qur'an,p.1
32. Arberry,The Koran Interpreted,p.94
33. Muhammad Asad,The Message of the Qur'an (Gibraltar:Dar al-Andalus,1980) p.132
34. Pickthall,The Meaning of the Glorious Qur'an(Birmingham:Islamic Dawah Centre International, 2008) p.64
35. Yusuf 'Ali,A.,The Holy Qur'an---Text,Translation and Commentary,p.226
36. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted p.161
37. Muhammad Asad,The Message of the Qur'an,p.226/ Yusuf 'Ali,A.,The Holy Qur'an --- Text, Translation and Commentary,p.388
38. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted p.207
39. Muhammad Asad,The Message of the Qur'an,p.305
40. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted,p.232

41.Pickthall, The Meaning of the Glorious Qur'an ,p.145
42. Arberry,A.J.,The Koran Interpreted,p.596
43. Pickthall,The Meaning of the Glorious Qur'an,p.356
44. Yusuf 'Ali,A.,The Holy Qur'an---Text,Translation and Commentary,p.1576
45. Muhammad Asad,The Message of the Qur'an,p.879
46. Kidwai,A.R.,A Survey of English Translations of the Quran,The Muslim World Book Review, vol.7, No.4 (Summer 1987) Also available at: www.islam101.com/quran/transAnalysis.htm
47. Khaleel Mohammed, "Assessing English Translations of the Qur'an" The Middle East Quarterly, Spring 2005/available at www.meforum.org/717/assessing-english-translations-of-the-quran
48. Rosenthal,E.I.J., Arthur J.Arberry--- A Tribute ,Relgious Studies,vol.6,No.4(Decemder,1970)p.301
49.Nabia Abbott ,Book Review, Journal of Near Eastern Studies,vol.17.No.1(Jan.,1958)p.78
50. Katsh,Abraham I.,The Koran Interpreted(Book Review)Jewish Social Studies,20(1958)p.237
51. Devenny,Joseph A.,The Koran Interpreted(Book Review)Theological Studies,No.17(1956)pp.440-441
52.Adams,Charles J.,Qur'an in The Encyclopedia of Islam(New York:Macmillan Publishing Company,1987)vol.12,p.175
53.Christmann,A.,Review:The Noble Qur'an,Journal of Semitic Studies,vol.47,No.2,p.372
54. Isma'il Ibrahim Nawwab,A Matter of Love: Muhammad Asad and Islam,Islamic Studies,vol.39,No.2(2000)p.183
55. Nabia Abbott ,Book Review, Journal of Near Eastern Studies,vol.17.No.1(Jan.,1958)p.78
56. Watt,W.Montgomery,Companion to the Qur'an:Based on the Arberry Translation(London:George Allen $ Unwin Ltd.,1967)355pp./For review please see: Burton,J., Review,Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London,vol.32,No.2(1969)p.387
57. Ibid,p.10

*****